Regd. L. NO.7243

Phone. 20[illegible]

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل 1973

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

ٹیلیفون
۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور

بدلِ اشتراک
سالانہ پاکستان دس روپے
سالانہ غیر ممالک ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
ایک روپیہ

جلد (۲۶) — اپریل ۱۹۷۳ء — نمبر (۴)

فہرست

(۱) لمعات ——— ۲
(۲) ۲۱ اپریل (بیادِ اقبالؒ) ——— ۶
(۳) باب المراسلات۔ (جہیز کے متعلق قانون) ——— ۱۵
(۴) تفہیم القرآن (جلد چہارم۔ مودودی صاحب) پر ایک نظر ——— (شاہد عادل) ۱۷
(۵) جدید تعلیمی پالیسی ——— (محترم چوہدری عطاء اللہ صاحب) ۳۳
(۶) مجلس مذاکرہ (منعقدہ طلوعِ اسلام کنونشن) ——— ۴۱
(۷) حقائق و عبر۔ ڈکٹاتم ایک ایک منڈی۔ معتبر ترین شہادت۔ اور مفتی صاحب نے فرمایا۔ تیب اور دو قومیتیں۔ خبر یہود بن گیا۔ کتاب اللہ ... دوست ——— ۵۹
(۸) رابطہ باہمی ——— ۶۳

ایڈیٹر: محمد خلیل، ناشر: مسلم ... مقام اشاعت ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

ربیع الاوّل کا مبارک و مسعود مہینہ اپنی جاں نوازشادابیوں اور بصیرت افروز تابانیوں کے ساتھ پھر وجہ تازگی عالم ہوتا ہے اور اُس انقلابِ عظیم کی یاد تازہ کر رہا ہے جو دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسانی تمدّن کے متعلق عام تحقیق یہی ہے کہ اس کی عمر پانچ چھ ہزار سال سے زیادہ نہیں۔ اس نقطۂ نظر سے غور کیجئے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گی کہ انسانی علم و تہذیب نے جو ترقی، نبی اکرمؐ کے ظہورِ قدسی کے بعد ڈیڑھ ہزار سال کے عرصہ میں کی ہے اس سے قبل چار پانچ ہزار سال کے عرصہ میں اس کا عشرِ عشیر بھی اس کے حصے میں نہیں آیا تھا۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

> حضورؐ کی بدولت زندگی نے علم کے ان سرچشموں کا سراغ پالیا جن کی اسے اپنی نئی شاہراہوں کے لئے ضرورت تھی۔ اسلام کا ظہور استقرائی علم کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور اس تکمیل سے اس نے خود اپنی خاتمیت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اس کے شعورِ ذات کی تکمیل ہوگی تو یونہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے مذہبی پیشوائیت اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ قرآن کریم، غور و فکر اور تجارب و مشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے اور تاریخ اور فطرت دونوں کو علم انسانی کے ذرائع ٹھیراتا ہے۔
>
> (خطباتِ تشکیلِ جدید۔ صفحہ ۱۲۰)

دنیا نے علم و بصیرت اور تہذیب و تمدن میں اس ڈیڑھ ہزار سال کے عرصہ میں جس قدر محیّر العقول اور برق رفتار ترقی کی ہے، اس کا بنیادی سبب انسانی فکر کی وہ تبدیلی ہے جو بعثتِ محمدیہ نے پیدا کی اور جس سے زندگی کے محاسب نے تعبیرِ نو اختیار کی۔ یہ دعوے کہ دنیا کی اس حیاتِ نو کا بنیادی سبب ظہورِ قدسی ہے، ہماری عقیدت مندی پر مبنی نہیں، بلکہ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف غیر مسلم محققین تک نے کیا ہے۔ ان کا اعلان یہ ہے کہ

> یورپ کی نشاۃ ثانیہ پندرھویں صدی میں نہیں ہوئی بلکہ اس وقت ہوئی جب یورپ عربوں کے کلچر سے متاثر ہوا...... اگر عرب نہ ہوتے تو یورپ کی تہذیب کا وجود عمل میں نہ آتا۔ ان کے بغیر یہ یقیناً اس خصوصیت کو حاصل نہ کر سکتا تھا جس نے اسے ارتقائی مراحل میں بلند ترین سطح پہ لا کھڑا کیا...... عصرِ حاضر کی حقیقی قوت کا راز سائنس میں ہے۔ اور ہماری سائنس کا وجود عربوں کا شرمندۂ احسان ہے۔ اسلام سے پہلے کی دنیا درحقیقت "زمانہ قبل از سائنس" تھی۔　　　(تعمیرِ تشکیلِ انسانیت)

اس ذاتِ اقدس و اعظم (علیہ التحیۃ والسلام) کی عدیم النظیر تعلیم نے دنیائے علم و بصیرت ہی میں انقلاب پیدا نہیں بلکہ ایک ایسے آئینِ جہانبانی و جہاں رانی کی بھی بنیاد رکھی جو انسان کو حقیقی آزادی عطا کر کے، اس کی پستیوں کو سرفرازیوں سے بدل دے، اور یوں دنیا اور آخرت دونوں میں، اسے خوشگواریوں اور سربلندیوں کی جنت سے ہم آغوش کر دے۔

> نبی اکرمؐ ایک مذہب ہی کے بانی نہ تھے بلکہ ایک سلطنت کے بھی تھے۔ لیکن ایک ایسی سلطنت کے جو شروع ہی سے دینی سلطنت تھی یعنی جس میں دنیا اور آخرت دونوں کا امتزاج تھا۔ اسلام کے پیشِ نظر یہ تھا کہ تمام انسانوں کے امتیازات مٹا کر انہیں ایک جماعت بنا دیا جائے جس کا مسلک قانونِ خداوندی اور اس کے رسول کی اطاعت ہو اور اس طرح حق کو ساری دنیا پر پھیلا دیا جائے۔ محمدؐ دنیا میں "خدا کی مرضی" کی تنفیذ و اشاعت کے لئے مرکزی ہیئتِ اجرائیہ کے مالک تھے۔ انہوں نے اپنے پیشرو انبیاءؑ کی طرح محسوس کر لیا تھا کہ تمام نوعِ انسان ایک دن ملتِ واحدہ بن کر رہے گی۔ — یعنی ایک خدا کے ماتحت ایک حکومت — اس نے انسان کے تمام فرائضِ حیات کو ایک لفظ میں سمیٹ کر رکھ دیا۔ اور وہ لفظ ہے اسلام۔ یعنی اپنے جذبات اور ارادوں کو مشیتِ ایزدی کے تابع رکھنا۔ یہ تسلیم و رضا اس اطاعت و انقیاد سے مختلف ہے جو مادی ریاست میں حکومت کی طرف سے مطلوب ہوتی ہے۔ کسی مسولینی کے سامنے جھکنے اور خدا کے سامنے میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے جو خدا کے سامنے جھک کر مسلم بن جاتا ہے، اس کے ذمے اس دنیا اور اگلی دنیا دونوں کے فرائض عاید ہو جاتے ہیں یعنی اخلاقی بھی اور روحانی بھی — خدا کی مرضی معلوم کرنا اور اس کی تعمیل کرانا — اس طرح مسلم، بیک وقت ایک راہب اور ایک سپاہی بن جاتا ہے۔ نمازی بھی بنتا ہے اور میدانِ جنگ میں جانے کے لئے بھی ہر وقت تیار رہتا ہے — لیکن صرف اس جنگ کے لئے جو دنیا میں شر کو مٹانے کے لئے کی جائے۔

(SPLADING – CIVILISATION IN EAST & WEST.)

لیکن دنیائے علم اور جہانِ تمدن و سیاست سے کہیں زیادہ گہرا انقلاب وہ تھا جو حضور رسالتمآبؐ (فداہ ابی و امی) نے دلوں کی دنیا میں پیدا کر دیا اور اس کا حقیقی ذریعہ حضورؐ کا بلند ترین کردار اور مقدس ترین سیرت تھی — وہ عظیم المرتبت کردار جس کی رفعت و بلندی کو دیکھ کر دنیا کے بڑے بڑے مؤرخین ہمہ تن استفسار ہیں کہ بالآخر اس کا راز کیا تھا؟ وہ اس فرطِ حیرت و وفورِ تعجب میں بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ

> آج جبکہ خود ہمارے عہد کے انسانوں نے ان تمام تفاصیل کو بے نقاب کر دیا ہے جو اس انقلاب آفریں شخصیت کی زندگی سے متعلق ہیں — اس کی ابتدائی اور آخری، ہر دو ادوارِ حیات سے متعلق — اس حقیقت کا کماحقہ سمجھنا پھر بھی آسان نہیں ہوا کہ اس عظیم القدر ہستی کا کردار کس قدر بلند، اور اس کی کامیابی کا راز کیا تھا؟ اس نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اسے خدائی قوتیں حاصل ہیں۔ اس نے اپنے آپ کو ایک عام انسان اور خدا کے پیغمبر سے زیادہ حیثیت کبھی نہیں دی۔ بایں ہمہ اس نے اپنی قوم کے ممتاز ترین افراد کو اپنا حلقہ بگوش بنا لیا اور ان پر اپنے کردار کا ایسا گہرا اثر ڈالا کہ نہ اس زمانے میں جبکہ آپ چاروں

طرف سے مصائب و آلام نے گھیر رکھا تھا اور نہ اُس وقت جب وہ ایک عظیم الشان مملکت کا مالک بنا، اُسے اپنی جماعت کے کسی ایک فرد کے خلاف غداری کی شکایت ہوئی۔ اُسے اپنی ذات پر اعتماد اور نصرتِ خداوندی پر یقینِ محکم شکست اور مایوسی کی حالت میں اُس سے بھی کہیں زیادہ ہوتا تھا جب وہ فتح و ظفر کے عالم میں دشمنوں سے اپنی شرائط منواتا تھا۔ اس نے اسی طرح ساری زندگی بسر کی اور اس کے بعد) اپنے متبعین عقیدت مندان اور احباب کے حلقہ میں (نہایت سکون سے) آنکھیں بند کریں۔ نہ اس کی زندگی کا کوئی گوشہ زیرِ نقاب رہا، نہ اُس کی موت کسی رازداری کی موت ہوئی۔

(HYNDMAN — THE MAKING OF ASIA)

حضورؐ کی یہی وہ مقدس ترین سیرت اور بلند ترین کردار ہے جسے رب کائنات نے شرف و مجد انسانیت کی معراجِ کبریٰ قرار دیا۔ وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَىٰ (۵۳/۷) اور نوعِ انسان کے لئے حسین ترین نمونہ ٹھہرایا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳/۲۱)

کا ارشادِ خداوندی اس پر شاہد ہے۔

یوں تو حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو انسانی زندگی کے متعلقہ شعبہ کے لئے اسوۂ حسنہ قرار نہ پائے اور اس چودہ سو سالہ تاریخِ انسانیت کا کوئی دور ایسا نہیں گذرا جس میں اس راہ نمائی کی احتیاج محسوس نہ کی گئی ہو۔ لیکن عصرِ حاضر میں جس مسئلے نے جملہ اقوامِ عالم کو وقفِ صد اضطراب کر رکھا ہے، اور جس کی وجہ سے آج یہ کرۂ ارض جہنم کا نمونہ بن رہا ہے، وہ مسئلہ قومیت ہے۔ انسانی فکر اس پیچیدہ تر اور انتہائی تشویش انگیز مسئلہ کے اطمینان بخش حل کے دریافت کرنے میں ناکام رہی ہے اور ناکام رہے گی۔ جب تک یہ آقائے انسانیتؐ کے اسوۂ حسنہ سے راہ نمائی حاصل نہیں کریگی۔ نوعِ انسانی کے اس محسنِ اعظمؐ نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے خون، رنگ، نسل اور وطن کے تمام امتیازات ختم کر کے آئیڈیالوجی کے اشتراک پر ہئیتِ اجتماعیہ انسانیہ کا ایک نیا نقشہ قائم کیا۔ انسانی قومیت کی اس عالم آرا اور انوکھی تشکیل میں حبش کے بلالؓ اور روم کے صہیبؓ، اس قائدِ انسانیتؐ کی اپنی ملت کے افرادِ قرار پا گئے اور گھر کے ابولہب اور ابوجہل (حقیقی چچا ہونے کے باوجود) غیر قوم کے افراد بن گئے۔ قومیت کی اس تشکیلِ نو کا نقشہ اس وقت پوری طرح نکھر کر دنیا کے سامنے آگیا جب بدر کے میدان میں حضرت ابوبکرؓ ایک طرف شمشیر بکف کھڑے تھے اور ان کا بیٹا دوسری طرف۔ حضرت عمرؓ اس طرف تھے تو ان کے ماموں دوسری طرف۔ حضرت علیؓ ادھر تھے اور ان کے بھائی عقیل اُدھر۔ حضرت حذیفہؓ ادھر تھے اور ان کے باپ عتبہ اُدھر۔ خود کاروانِ انسانیت کا سالارِ اعظمؐ ایک طرف تھا اور اس کا حقیقی چچا عباس اور داماد ابوالعاص دوسری طرف۔ آسمان کی نگاہیں پہلی بار عصبیتِ جاہلیہ کے رشتوں کو تلوار کی دھار سے کٹتے دیکھ رہی تھیں اور آئیڈیالوجی کے اشتراک پر ایک ایسی ملت ظہور میں آرہی تھی جس کا سر دامان گردِ وطن سے پاک تھا۔ قبیلوں، ذاتوں اور نسلوں کے تعصبات سے پاک تھا جس میں محمود و ایاز شانہ بشانہ حقیقی بھائیوں کی طرح ایک صف میں کھڑے تھے۔ جس میں نہ عربی کو عجمی پر کوئی فوقیت حاصل تھی نہ عجمی کو عربی پر کوئی امتیاز۔ جمعیتِ آدم کا یہ انوکھا اور آسمانی تصور۔ نوعِ انسانی کے بھٹکے ہوئے قافلوں کو ببانگِ دہل بتا رہا تھا کہ انسانیت ایک مستقل اور ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ اور قبیلوں، ملکوں، خاندانوں، نسلوں کی بنا پر اس کے حصے بخرے نہیں کئے جاسکتے۔ اس عالمگیر انسانی نظام کو رنگ وخون

کے امتیازات میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں نہ جغرافیائی تقسیم کی لکیریں کھینچی جا سکتی ہیں اور نہ مختلف قومیتوں کے نام پر کوئی دیواریں کھڑی کی جا سکتیں۔ تاریخِ انسانی کا وہ کس قدر وجد آفریں منظر تھا جب حجۃ الوداع کی تقریب پر عرفات کے میدان میں قائدِ انسانیت کی زبانِ مبارک سے وحدتِ انسانیہ کے آخری منشور کا اعلان کیا جا رہا تھا کہ:

> اے نوعِ انسان! یاد رکھو تمہارا رب ایک ہے اور تمہاری اصل بھی ایک ہے۔ نہ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت حاصل ہے نہ عجمی کو عربی پر۔ نہ ہی سرخ کو سیاہ پر کوئی فوقیت ہے، نہ سیاہ کو سرخ پر۔ وجہِ افضلیت اور معیارِ فوقیت فقط تقویٰ ہے۔ یاد رکھو! زمانۂ جاہلیت کے تمام باطل نظریاتِ حیات میرے پاؤں کے نیچے کچلے پڑے ہیں۔

اور دوسری طرف خالقِ کائنات کی بارگاہ سے وحیِ خداوندی کا آخری پیغام نازل ہو رہا تھا کہ۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ

نوعِ انسانی کے نام وحی کی یہ آخری آواز بتا رہی تھی کہ وحدتِ انسانیہ کا قیام منشائے دین کا اتمام ہے۔ یہ ہو گیا تو تکمیلِ دین کے مقصدِ عظیم کی بجا آوری بھی ہو گئی۔ نبوت کا یہی وہ شاہکارِ عظیم تھا جس کی تشکیل حضور رسالتمآب کے مقدس ہاتھوں اپنے حاصلِ کمال کو پہنچی اور تشکیلِ قومیت کے سلسلے میں فکرِ انسانی کے صدیوں کے ناکام تجربوں کے بعد علم و بصیرت کی بارگاہیں آج بجا طور پر اس حقیقت کا اعتراف کر رہی ہیں کہ قومیت کی حقیقی تشکیل آئیڈیالوجی اور صرف آئیڈیالوجی کے اشتراک پر ہونی چاہیئے۔ رنگ، نسل اور وطن کی اساس پر اس کی تشکیل کے تمام تجربے ناکام (بلکہ ہلاکت آفریں) ثابت ہو چکے ہیں۔

یوں تو اس معیارِ قومیت کے اپنانے کی ضرورت ساری دنیا کو ہے لیکن پاکستان کی ہستی کا دار و مدار اسی پر ہے۔ اسی معیار کی بنا پر اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا اور اسی پر اس کے استحکام و بقا کا دار و مدار ہے۔ نسل کی بنیادوں پر پٹھان، پنجابی، سندھی، بلوچی کی تمیز و تفریق یکسر خلافِ اسلام اور جغرافیائی حدود کی لکیروں کی بنا پر قومیتوں کا تصور نظامِ جاہلیت کے احیاء کی کوشش۔ آج حفظ و بقائے پاکستان کے لئے اشد ضروری ہے کہ قرآن کے اس اصولِ اساسی اور سیرتِ طیبہ کے اس تابناک گوشہ کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے اور اسے مملکت کی سالمیت اور بہی خواہی کا مدار قرار دیا جائے۔ اور اس کا گوشے گوشے میں اعلان کیا جائے کہ نسلی امتیازات یا صوبجاتی تفریقات کی بنا پر مختلف قومیتوں کا نظریہ مملکت سے غداری اور اسلام سے بیزاری کے مرادف ہے۔

بحالاتِ موجودہ ربیع الاول کی یہی پکار ہے۔

ضرورت رشتہ

دو ایم۔ اے، بی۔ ٹی، باسلیقہ، خاندانی، خوب سیرت خواتین کے لئے ایسے نوجوانوں کے رشتے مطلوب ہیں، جو مستقل اور معقول آمدنی رکھتے ہوں۔ اور عمر ۳۵ اور ۴۰ سال کے درمیان ہو۔

خط و کتابت بنام۔ "ص ق" معرفت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

۲۱ اپریل

بیادِ اقبالؒ

اس سال یہ حسنِ اتفاق موجبِ صد مین و سعادت ہے کہ ایک طرف بہار کا موسم ہے جس میں ہر شاخِ خزاں دیدہ سے حیاتِ تازہ انگڑائیاں لیتی ہوئی ابھرتی ہے۔ دوسری طرف ربیع الاول کا مہینہ ہے جس میں اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کا ظہور ہوا جس نے انسانیت کو زندگی بخش انقلابِ نو کا پیغام دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اپریل کا مہینہ ہے جس میں وہ نغمہ خوانِ سرودِ ازلی جو عمر بھر پیغامِ محمدیؐ کی نشید جانفزا سے ملت کے جسدِ بے جان میں تازہ روح پھونکتا رہا ۔ آسوئے افلاک چلا گیا۔

ہم نے جب ۲۱ اپریل کی یاد میں کچھ لکھنے کے لئے قلم اٹھایا تو ہمارے ذہن میں فوراً وہ نقوش ابھرے جو ہم نے آج سے ٹھیک بیس سال پہلے اسی تقریب کے سلسلہ میں ان صفحات پر ثبت کئے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ جو کچھ ہم نے اس وقت لکھا تھا وہ بیس برس کی مدت دراز گذرنے کے بعد بھی اسی طرح تر و تازہ ہے۔ اور چونکہ وہ اقبالؒ کے پیغام کی برجستہ ترجمانی کرتا ہے۔ اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ انہی افکار سے اس پیغامِ انقلاب کی یاد تازہ کرائی جائے۔

اور وہ افکار یہ تھے ۔

(۰)

یوں تو قصصِ قرآنی کا ہر ٹکڑا عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے اور جوں جوں نگہ دور رس غور و تدبر سے ان کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے ان کے حقائق و رموز زمانہ کی پیچ در پیچ لہروں کی طرح خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں لیکن ان قصص میں داستانِ بنی اسرائیل کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس میں قوموں کے عروج و زوال کے اصول و مبادی اس جامعیت سے سمٹا کر رکھ دیئے گئے ہیں کہ وہ بصائر و حکم کی ایک مستقل دنیا بن گئی ہے۔ فسادِ آدمیت کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے تین گوشے نمایاں طور پر ابھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ استبدادِ حکومت کی سرکش طغیانیاں، برہمنیت کی خواب آور و فسوں خیز فریب کاریاں اور سرمایہ کاری کی پُر سکون خون آشامیاں۔ ان میں سے ہر ایک فتنہ بجائے خویش انسانیت کا گلا گھونٹ دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ذرا سوچئے کہ جس دور میں بیک وقت سطحِ ارض پر سبعیت و بہیمیت کے ایسے ہولناک عفریت، فضا میں تباہی و بربادی کے ایسے ہلاکت انگیز جراثیم اور دریا کی سکون انگیز ساتھ سطح کے نیچے ایسے خوفناک نہنگ و اژدر موجود ہوں، وہاں خدا کی مخلوق پر کیا کیا قیامت گذری ہوگی ؟ تاریخِ مصر کا یہی دور تھا جس کا تذکرہ قرآنِ کریم میں اس شرح و بسط سے آیا ہے۔ فرعونؑ

استبداد ملوکیت کا مجسمہ، ہامان برہمنیت کی ابلیسانہ روباہ بازیوں کا پیکر۔ اور قارون سرمایہ داری کی لعنت کا سب سے بڑا نمائندہ۔ تینوں یکجا۔ اور ان کے آہنی پنجے میں (بنی اسرائیل کی شکل میں) تڑپتی، پھڑکتی، بلبلاتی انسانیت۔ حضرات انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کے جور و استبداد سے چھڑا کر براہِ راست اللہ کے قانون کی اطاعت میں لے آئیں۔ (برقِ طور)

انسانیت کی پوری تاریخ پر غور کیجئے جس زمانہ میں، جس قوم میں اور جس ملک میں فساد دکھائی دے تحقیق کے بعد معلوم ہو جائیگا کہ اس فساد انگیزی میں انہی تین عناصر کا ہاتھ کارفرما تھا۔ ملوکیت، سرمایہ داری اور ملائیت (PRIEST HOOD) زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ یہ ابالیس اپنے پیکر بدلتے رہے لیکن روح وہی رہی اور ہمیشہ وہی رہے گی۔ اگر قرآن پر بنگاہِ تعمق غور کیا جائے تو حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ حضرات انبیاء کرام کی دعوت ہمیشہ انہی فساد انگیز عناصر کے خلاف، دعوتِ انقلاب ہوتی تھی۔ وہ لوگوں کو قانونِ خداوندی کے مرکز پر جمع کرتے تاکہ ملوکیت، سرمایہ داری اور ملائیت کے تختوں کو الٹ دیا جائے۔ وہ اس انقلابی کوشش میں ہوتے اور ان کے خلاف یہی قوتیں سر جوڑ کر اٹھ کھڑی ہوتیں تاکہ مظلوم انسانیت ان کے پنجۂ استبداد سے نکلنے نہ پائے۔ امم سابقہ کی داستانیں جو قرآن میں مذکور ہیں اسی کشمکش کی سرگذشت ہیں۔ قرآن خدا کا آخری ضابطۂ حیات تھا اور نبی اکرمؐ خدا کے آخری پیغمبر۔ اس لئے قرآن کریم کے ذریعہ، نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں اس کشمکش کو اس کے آخری مراحل تک پہنچا دیا گیا۔ ملوکیت، سرمایہ داری اور ملائیت کی ایک ایک قوت کو پاش پاش کر دیا گیا اور انسانیت کو اس آزادی اور صحیح حریت سے آشنا کرا دیا گیا جو ضابطۂ خداوندی کا منشاء و مقصود تھا۔ یہی تھے وہ سلاسل و اغلال جنہیں توڑنے کے لئے رسول اللہ صلعم تشریف لائے تھے۔ (وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ) آپ نے ان تمام زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا جن میں انسانیت جکڑی چلی آ رہی تھی۔

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست ؎ نقش ہائے کاہن و پاپا شکست

لیکن یہ دور بہت تھوڑے عرصہ تک قائم رہا۔ اس کے بعد خود مسلمانوں نے ان زنجیروں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو اپنی مژگانِ عقیدت سے ایک ایک کر کے چنا اور اس طرح اپنے گلے میں ڈال لیا کہ پھر کوئی طاقت انہیں توڑ نہ سکے۔ آسمان کی آنکھ اس تماشہ کو دیکھ کر رو رہی تھی کہ اس قوم کو کیا ہو گیا کہ

خود طلسم قیصر و کسریٰ شکست خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

جب ہم اپنی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو فرطِ حیرت سے انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ مسلمان اس دعوتِ قرآنی تو ایک طرف، غیر انسانی زندگی کا اس درجہ خوگر ہو گیا کہ اسے قفس کو چھوڑ کر آشیانہ کی زندگی موت نظر آنے لگی۔ مؤرخین اس حیرت انگیز انقلاب کے اسباب و علل تلاش کرتے ہیں لیکن اس کے اسباب تو بالکل نمایاں ہیں۔ مفاد پرست گروہ نے اقتدار کی کرسیوں اور رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ملائیت نے ابلیسانہ نظام کو عینِ اسلام بنانے کے لئے سندات مہیا کر دیں۔ وہ ان کے وظیفے مقرر کر دیتے تھے اور یہ منبروں پر کھڑے ہو کر اپنے خطبات میں انہیں ظل اللہ قرار دے کر ان کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ یہ وہی فرعون و قارون و ہامان کی ملی بھگت تھی جس کا ذکر شروع کے اقتباس میں کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ کے ایسے بندے بھی پیدا ہوتے رہے ہوں جنہوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی ہو لیکن جیسا کہ ہر استبدادی قوت کیا کرتی ہے ان کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ ان کی آواز کو دبا دیا گیا اور ان کے آثار تک کو مٹا دیا گیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ آج ہمارے ہاں ملوکیت اور

ملائیت کی تاریخ تو پوری کی پوری موجود ہے لیکن اس کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا ذکر تک کہیں نہیں ملتا۔ بجز اس کے کہ کہیں اِدھر اُدھر، یہاں وہاں، کوئی بکھری ہوئی پنکھڑی ہنسلی ہوئی مل جائے۔ اس سارے طوفانِ بلا میں اگر کوئی امید کا سہارا تھا تو یہ کہ خدا کی کتاب (غلافوں میں لپٹی ہوئی سہی) محفوظ چلی آرہی تھی۔

یہی تھی خدا کی وہ کتاب جس پر ہمارے دور کے ایک مردِ مسلمان (علامہ اقبالؒ) نے اپنے نالۂ سحری اور گریۂ نیم شبی کے ساتھ غور و فکر کیا۔ تاریخِ عالم کے اوراق، قوموں کے عروج و زوال کے اسباب اور عصرِ حاضر کے علوم و فنون تک میں اسے پوری پوری دسترس تھی۔ وہ اس سرمایہ کو لے کر قرآن کی گہرائیوں میں اترا اور وہاں سے اس حقیقت کو پاکر باہر آیا کہ مسلمان کی یہ حالت کیوں ہو گئی۔ یہ وہی حقیقت تھی جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس نے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ مسلمان کی یہ حالت اس لئے ہوئی ہے کہ

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر	سود خوار و والی و ملا و پیر

اس نے مسلمان سے برملا کہہ دیا کہ

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری	اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

اس نے اپنی تمام عمر منافیِ آدمیت کے انہی گوشوں کے خلاف جہاد میں بسر کر دی۔ اور اسی غم میں سسکیاں لیتے ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو یہاں سے چل دیا اور اب عالمگیری مسجد کے زیرِ سایۂ دیوار آسودۂ خواب ہے۔

آسماں اس کی لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اس نے مسلمان کو بتایا کہ ملوکیت کا فتنہ کس قدر غارت گرِ دین و دانش ہے اور اس کے ماتحت کس طرح انسانی سیرتیں مسخ ہو جاتی ہیں۔ اس نے کہا کہ

از ملوکیت نگہ گردد دِگر	عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

اس نے کہا کہ جس جگہ ملوکیت ہو وہاں حق کا جھنڈا کبھی بلند نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مسلمانوں کو کبھی اپنے آپ کو اس فریب میں نہیں رکھنا چاہیئے کہ ہماری سلطنتیں اسلام کی سلطنتیں تھیں اور ان کا نظام قرآن کا نظام تھا۔ اس نے کہا کہ

رایتِ حق از ملوک آمد نگوں	قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں

ارمغانِ حجاز میں اقبالؒ نے خلافت اور ملوکیت کے فرق کو ایک قطعہ میں اپنے دلکش انداز میں واضح کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ

خلافت بر مقامِ ما گواہی است	حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ	خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

حفظِ ناموسِ الٰہی کے معنی یہ ہیں کہ خلافت ضابطۂ خداوندی، یعنی قرآنی نظام کی عملی تشکیل کی ذمہ دار ہوتی ہے اور اس طرح اس کے ہاتھوں دنیا میں ناموسِ خداوندی کا تحفظ ہو جاتا ہے۔ اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ملوکیت کے معنی صرف اسی قدر نہیں کہ باپ کے بعد بیٹا وارثِ تخت و تاج ہو جاتا ہے۔ قرآن (اور اقبالؒ) کے نزدیک ملوکیت ہر اس نظام کا نام ہے جس میں غیر قرآنی قوانین رائج ہوں، خواہ اس کی شکل پادشاہی کی ہو یا جمہوریت کی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

دنیا نے، زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر، (کہ جو درحقیقت خدا کے کائناتی قانون کے تقاضے ہیں) اتنی چیز کو تو تسلیم کر لیا ہے کہ باپ کے بعد بیٹا وارثِ تخت و تاج نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ ان کے پاس خدا کا ضابطہ قوانین نہیں ہے اس لئے ان کی حالت اب بھی یہ ہے کہ

رست از یک بند تا افتاد در بندِ دگر

وہ اب یہ سمجھتے ہیں کہ انسانوں کی ایک جماعت (اکثریت) کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس قسم کے قوانین چاہے مرتب کرے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ برسرِ اقتدار طبقہ اس قسم کے قوانین وضع کرتا رہتا ہے جس سے دولت کے سرچشمے ان کے ہاتھ میں رہتے ہیں۔ اور وہ اس سرمایہ داری سے وہ کچھ کرتے ہیں جو کچھ ایک شخصی حکومت میں ایک بادشاہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس، قرآن جہاں ملوکیت کو ختم کرتا ہے وہاں سرمایہ داری کو بھی فنا کر دیتا ہے۔ بقول اقبالؒ

چیست قرآں خواجہ را پیغامِ مرگ
دست گیرِ بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو
لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوا

اقبالؒ واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ سرمایہ داری، زمینداری اور جاگیرداری درحقیقت آئین و دستورِ ملوکیت ہی کی شاخیں ہیں اور شجرۃ الزقوم کی ان شاخوں کا وہی پھل ہے جو خود ملوکیت کا۔ یعنی

حاصلِ آئین و دستورِ ملوک
دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک

یہی وجہ ہے کہ قرآن جہاں جمع کردہ دولت کو جہنم کا ایندھن قرار دے کر آئینِ سرمایہ داری کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے، وہاں وہ یہ حکم دے کر کہ وسائلِ پیداوار (ارض) کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں دیئے جا سکتے، زمینداری یا جاگیرداری کے نظام پر بھی خطِ تنسیخ کھینچ دیتا ہے۔ یہی ہے وہ حقیقت جس کا اقبالؒ نے بار بار اعلان کیا ہے کہ

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت
ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا نکتۂ از من پذیر
رزق و گور از وے بگیر او را مگیر!

حتیٰ کہ اس نے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ

باطنِ "الارض للہ" ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

ذرا آگے چل کر اسی (جاوید نامہ) میں کہتے ہیں کہ

رزقِ خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست
ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو
چیست شرحِ آیۂ لَا تُفْسِدُوا
ابنِ آدم دل بہ ابلیسی نہاد
من ز ابلیسی ندیدم جز فساد

اس مقام پر انہوں نے پھر اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ خلافت اور سلطنت میں یہی فرق نہیں کہ خلیفہ منتخب ہوتا ہے اور سلطان اپنی سلطنت کو وراثت میں پاتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اصل فرق یہ ہے کہ

مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطاں غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

لیکن اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی نے اس حقیقت کو بھی بھانپ لیا تھا کہ ملوکیت، سرمایہ داری، زمینداری کی لعنتیں جس قوت کے سہارے پنپتی اور پروان چڑھتی ہیں وہ ملائیت کی بنیادی لعنت ہے۔ ہر شخص جو ذرا عقل و فکر سے کام لے، بآسانی محسوس کر لیتا ہے کہ ملوکیت سرمایہ داری اور زمینداری یکسر غیر فطری نظامِ زندگی ہیں لیکن جب مُلّا اسے یہ بتاتا ہے کہ یہ سب کچھ خدا اور رسولؐ کے حکم کے مطابق ہے اور ان سے انکار کرنے والا خدا کا سرکش اور ذاتِ رسالتؐ کا منکر، تو وہ بیچارہ خاموش ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مُلّا آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ شریعت میں عقل کا کوئی دخل نہیں۔ اگر کسی کے دل میں "خدا اور رسولؐ" کا حکم سننے کے بعد ذرا سا شک و شبہ بھی پیدا ہو جائے تو وہ سیدھا جہنم میں جا گرتا ہے۔ اس پر بیچارہ سادہ لوح مسلمان کانپ اٹھتا ہے اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ دین کی مصلحتیں خدا اور اس کا رسولؐ ہی جان سکتے ہیں' ہمارا کام ایمان لانا ہے اور بس۔ حالانکہ جس چیز کو مُلّا خدا اور رسولؐ کے احکام بتا کر پیش کرتا ہے وہ اسی نظامِ سرمایہ داری کے وضع کردہ آئین ہوتے ہیں۔ وہ ان سے انکار کرنے والوں پر "منکرینِ حدیث" کا لیبل لگا کر انہیں گلی کوچے میں بدنام کرتا رہتا ہے کہ یہ "ایک نیا اسلام" لے کر آ گئے ہیں یہ خدا کے احکام کے نافرماں بردار ہیں۔ یہ رسولؐ کی شانِ رسالت کے منکر ہیں۔ یہ اسلاف کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ ملوکیت اور سرمایہ داری کے زمانے کے پیدا کردہ احکام، خدا اور رسولؐ کے احکام نہیں ہو سکتے۔ لیکن مُلّا کا تو منصب ہی یہ ہے کہ وہ انہی احکام کو خدا و رسولؐ کے احکام بتا کر عوام کو فریب میں رکھے۔ یہ ہے وہ سب سے بڑا سحر جس کے سہارے ملوکیت اور سرمایہ داری کا نظام قائم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان "علمبردارانِ مذہب و شریعت" کی اس شدت سے مخالفت کی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ بھی عمر بھر اسی فتنۂ ملتِ بیضا کے خلاف جہاد کرتا رہا۔ کہیں اس نے کہا کہ

متاعِ شیخ اساطیرِ کہن بود — حدیثِ او ہمہ تخمین و ظن بود
ہنوز اسلامِ او زنار دار است — حرم چوں دیر بود او برہمن بود

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے ان سادہ اور مختصر سے الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جس چیز کا نام مُلّا نے خدا اور رسولؐ کا حکم رکھ چھوڑا ہے وہ درحقیقت اس کا خود ساختہ مذہب ہے جسے اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کا عجمی اسلام زنار پوش ہے اور یہ اس اسلام کا برہمن۔ اسے کچھ معلوم نہیں کہ حقیقی اسلام کیا ہے۔

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را — بیفشاں بر دو گیتی آستیں را
حقیقت را برندے فاش کردند — کہ مُلّا کم شناسد رمزِ دیں را

وہ کہتا ہے کہ قرآن تو اپنے الفاظ میں محفوظ ہے لیکن مُلّا اس قرآن کی تفسیر اپنے خود ساختہ تصورات کے مطابق کرتا ہے اور اس طرح قرآن، قرآن نہیں رہتا بلکہ عجمی مجوسیوں کی کتاب بن جاتا ہے

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر — تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

اسی حقیقت کو وہ "ارمغانِ حجاز" میں اس انداز میں بیان کرتا ہے کہ

زمن بر صوفی و مُلّا سلامے — کہ پیغامِ خدا گفتند ما را
ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت — خدا و جبرئیلؑ و مصطفیٰؐ را

یعنی مُلّا قرآن کے الفاظ تو وہی دہراتا ہے جنہیں خدا تعالیٰ نے بھیجا، جبرئیلؑ لایا اور رسول اللہؐ نے لوگوں تک پہنچایا۔ لیکن

اس قرآن کا جو مفہوم بتاتا ہے اسے دیکھ کر خدا، جبریل اور محمد صلے اللہ علیہ وسلم تینوں محوِ حیرت رہ جاتے ہیں کہ یہ کون سا قرآن ہے جسے اس طرح بیان کیا جا رہا ہے۔ ملّا کا یہی وہ خود ساختہ مذہب ہے جس نے مسلمانوں جیسی ہمہ تن برق قوم کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہی ہے وہ حقیقت جس کے احساس سے اقبالؒ کہتا ہے کہ

مکتب و ملّا سخنہا ساختند　　　　مومناں ایں نکتہ را نشناختند
زندہ قومے بود از تاویل مُرد　　　　آتشِ او در ضمیرِ اُو فسُرد

بظاہر ملّا کی باتیں سنیئے تو ایسا نظر آئے گا کہ دین کی حفاظت کا درد اسے کھائے جا رہا ہے لیکن اگر اس کے دل کو ٹٹول کر دیکھیے تو اس میں سوائے مصلحت بینی اور مفاد پرستی کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ خدا، رسولؐ، قرآن، احادیث، اسلاف، مذہب، شریعت، وہ مقدس اور حسین نقاب ہیں جن کی اوٹ میں اپنی مفاد پرستیوں کو آگے بڑھاتا رہتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں۔

دلِ ملّا گرفتارِ غمے نیست　　　　نگاہے ہست در چشمش نمے نیست
ازاں بگریختم از مکتبِ اُو　　　　کہ در ریگِ حجازش زمزمے نیست

اس کی مفاد پرستیوں کا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ ملت کو کبھی ایک نقطہ پر جمع نہ ہونے دے۔ فرقہ بندی (کہ جسے قرآن نے بنص صریح شرک قرار دیا ہے) اس کے اسلام کی اصل و بنیاد ہے۔ فرقہ بندی کی نفسیات یہ ہیں کہ اپنے فرقے کے لوگوں کے دل میں دوسروں کی طرف سے نفرت پیدا کی جائے۔ جس قدر نفرت شدید ہوگی اتنا ہی وہ فرقہ زیادہ مضبوط ہوگا۔ ملّا کی ساری عمر نفرت کے جذبات کو ہوا دینے میں گذر جاتی ہے۔

مرشدِ پیر کلامش نیش دار است　　　　کہ او را صد کتاب اندر کنار است
حضورِ تو من از خجلت نگفتم　　　　زخود پنہاں و برما آشکار است

اسی حقیقت کو اقبالؒ نے جاوید نامہ میں سعید حلیم پاشا کی زبان سے یوں بیان کیا ہے۔

دینِ حق از کافری رسواتر است　　　　زانکہ ملّا مومنِ کافر گر است
شبنمِ ما در نگاہِ ما یم است　　　　از نگاہِ اُو یمِ ما شبنم است

اس دوسرے شعر پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ کیا ملّا کی ساری عمر اسی "جہاد" میں نہیں گذر جاتی کہ وہ اپنے اور اپنے حواریوں کے سوا باقی مسلمانوں کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھے، ان کی ہنسی اڑائے، انہیں ذلیل سمجھے اور اپنے آپ کو "صالحین" میں شمار کرے۔ ان کے متعلق وہ یہاں تک بھی کہہ دے کہ

ان کے برائے نام مسلمان رہنے سے اسلام کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں بلکہ سراسر نقصان ہے۔

(تنقیحات۔ ابوالاعلیٰ مودودی ص۱۷۳)

مسلمانوں کے متعلق یہ کچھ اُس وقت کہا جا رہا تھا جب ہندوستان میں مسلمان موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ہندو کی پوری کوشش تھی کہ سارے ہندوستان پر اپنا قبضہ جما کر مسلمان کے جداگانہ تشخص کو ختم کر دے۔ اس کے برعکس تحریکِ پاکستان کے حامیوں کی کوشش تھی کہ ایک جداگانہ خطۂ زمین مل جائے جو مسلمانوں کے تحفظ کا ذریعہ بن جائے۔ عین اس کشمکش کے زمانے میں ملّا کی طرف سے یہ آواز بلند ہو رہی تھیں کہ یہ تحریک سراسر خلافِ اسلام ہے۔ "مردم شماری کے رجسٹر کا یہ پیدائشی مسلمان" باقی رہے یا مٹ جائے، اس سے اسلام کا کچھ نہیں بگڑتا۔ یہ تھے وہ تاثرات جن کے ماتحت اُس مردِ مومن نے باچشمِ نم کہا

تھا کہ

شبنم ما در نگاہِ ما یم است   از نگاہِ اُو یم ما شبنم است

اس کے بعد اقبالؒ سعید حلیم پاشا کی زبان سے کہتا ہے کہ

از شگر فیہائے آں قرآں فروش   دیدہ ام روح الامیں را در خروش

زاں سوئے گردوں دلش بیگانہٗ   نزدِ اُو ام الکتاب افسانہٗ

ملا کی قرآن فروشی کی داستانوں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں لیکن ماضی میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ آج اپنے سامنے دیکھ لیجئے کہ ملا کس جرأت اور بیباکی سے قرآن بیچ رہا ہے۔ غور کیجئے! خود پاکستان میں کتنے ایسے ملا ہیں جن کا بظاہر کوئی ذریعہ معاش نہیں لیکن جن کے پاس کوٹھیاں ہیں، موٹریں ہیں، ٹیلیفون ہیں، عیش و عشرت کے سامان ہیں۔ ملا کا گروہ دن رات چلاتا نظر آئے گا کہ حکومت کے کارندے بے ایمان ہیں، بددیانت ہیں، رشوت خوار ہیں، ان کی تنخواہیں قلیل ہیں لیکن ان کے پاس جائیدادیں کثیر ہیں۔ لیکن آپ نے آج تک کبھی کسی ملا کو یہ کہتے نہیں سنا ہو گا کہ فلاں مولوی صاحب کو دیکھئے کہ ان کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں (یا اگر ہے تو بہت قلیل ہے) لیکن وہ جائیدادیں بنوا رہے ہیں، ہزاروں روپے ماہانہ کا خرچ ہو رہا ہے۔ ٹھاٹھ سے زندگی بسر ہو رہی ہے۔ ذرا معلوم کرنا چاہئیے کہ بالآخر یہ روپیہ کہاں سے آ رہا ہے۔ ملا کی نگاہ کبھی ان کی طرف نہیں اٹھتی۔ کیوں اُٹھے۔ یہ تو معاصین کا گروہ ہے۔ یہ "شہداء علی الناس" کی جماعت ہے۔ ان کا کام دوسروں کے اعمال کی نگرانی ہے۔ اپنے گروہ کے متعلق لب کشائی نہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حمام میں سب ننگے ہیں۔ یہ ملا کے عمل کی کیفیت ہے اور علم کی یہ حقیقت کہ

بے نصیب از حکمتِ دینِ نبیؐ   آسمانش تیرہ از بے کوکبی

کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد   ملت از قال و اقولش فرد فرد

اس کے بعد وہ شعر سنئیے جن میں اقبالؒ نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا ہے جب کہا ہے کہ

مکتب و ملا و اسرارِ کتاب   کور مادر زاد و نورِ آفتاب

دین کافر فکر و تدبیر جہاد   دینِ ملا فی سبیل اللہ فساد

یہ شعر نہیں ایک چیخ ہے جو دل کی گہرائیوں سے اٹھی اور بے ساختہ زبان سے نکل کر آسمان سے جا ٹکرائی ہے۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ اسی عنوان کی تفسیر ہے کہ

"دینِ مُلا فی سبیل اللہ فساد"

یہ تھا حقیقت میں ابلیس کا وہ سب سے زیادہ مؤثر حربہ جو اس نے ملتِ اسلامیہ کے خلاف استعمال کیا۔ اسی حقیقت کو جاوید نامہ میں ابلیس کی زبان سے یوں ادا کیا گیا ہے کہ

مے حدیث و نے کتاب آوردہ ام   جانِ شیریں از فقیہاں بردہ ام

رشتۂ دیں چوں فقیہاں کس نہ رشت   کعبہ را کردند آخر خشت خشت

ملا کے اس مسلک فساد انگیزی، نفرت خیزی اور فتنہ جوئی کو اقبالؒ نے ذرا شوخ انداز میں (بالِ جبریل میں) اس طرح بیان کیا ہے۔

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا ۔ حق سے جب حضرتِ ملا کو ملا حکمِ بہشت

عرض کی میں نے الٰہی میری تقصیر معاف ۔ خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت

نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقوال ۔ بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

ہے بد آموزیٔ اقوام و ملل کام اس کا

اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

اقبالؒ نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ملا کے اس جذام کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ عوام کو مُلّا کے ہاتھ سے چھڑا لیا جائے۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مسلمانوں کے عوام کے دل میں بڑا خلوص ہے اور وہ ہر ممکن قربانی کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اس کے الفاظ میں :-

خیر و خوبی بر خواص آمد حرام ۔ دیدہ ام صدق و صفا را در عوام

اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ عوام بڑے سادہ لوح ہیں اور ملا انہیں مذہب کے نام پر ابھار کر اپنی مفاد پرستیوں کا آلۂ کار بنا لیتا ہے۔ یہی تھی وہ حقیقت جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا کہ

شیخِ شہر از رشتۂ تسبیح صد مومن بدام

اس کا علاج اس کے نزدیک اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں قرآن کے نظام کو از سرِ نو قائم کیا جائے۔ جونہی وہ نظام قائم ہو گیا ملوکیت، سرمایہ داری اور ملائیت خود بخود فنا ہو جائے گی کہ

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خدا است ۔ چوں یکے اندر قیام آئی فنا است

یہ تھا وہ مقصدِ جلیلہ جس کے لئے اس مردِ خدا اندیش نے پاکستان کا تصور دیا۔ یہ خطۂ زمین مل بھی گیا لیکن اس وقت جب اقبالؒ یہاں سے جا چکا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ وہی جذام جسے دور کرنے کے لئے اس نے اس خطۂ زمین کے لئے دعائیں مانگی تھیں[1] چاروں طرف سے امنڈ کر اسی خطۂ زمین میں جمع ہو گیا اور آج حالت یہ ہے کہ

زاغوں کے تصرف میں ہے شاہیں کا نشیمن

کتنا حسین تھا وہ خواب اور کس قدر بھیانک ہے اس کی یہ تعبیر۔ اگر چندے یہی کیفیت اور رہی تو کچھ بعید نہیں کہ یہ خواب پھر سے خوابِ پریشان بن جائے۔

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے ۔ فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

لیکن جب تک قرآن باقی ہے ہمارے لئے مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است ۔ سازِ قرآں را نوا ہا باقی است

زخمۂ ما بے اثر افتد اگر ۔ آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور

ذکرِ حق از امتاں آمد غنی ۔ از زمان و از مکاں آمد غنی

حق اگر از پیشِ ما بر داردش ۔ پیشِ قومے دیگرے بگذاردش

---

[1] اسے فراموش نہ کیجئے کہ یہ الفاظ اپریل ۱۹۳۵ء میں لکھے گئے تھے۔ (طلوعِ اسلام)

ایسے وقت میں اتنا صدمہ ضرور ہو گا۔

ترسم از روزے کہ محرومش کنند　　آتش خود بردلے دیگر زنند

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ۔ (۵/۵۴)

اے ایمان والو! جو تم میں سے نظامِ خداوندی سے روگردانی اختیار کرے گا تو اس قوم کی جگہ اللہ تعالےٰ ایسی قوم کو لے آئے گا جو نظامِ خداوندی سے محبت رکھے گی، اور وہ نظام اس قوم کو اچھے خوش آئند پائے گا۔ اس قوم کے افراد کی خصوصیات یہ ہوں گی کہ ان لوگوں کے مقابلے میں نہایت نرم اور جھکے ہوئے رہیں گے جو اس نظام کو اپنی زندگی کا نصب العین بنائیں (جو مومن ہوں) لیکن مخالفین کے مقابلے میں بڑے سخت ہوں گے وہ اس نظامِ خداوندی کے قیام و بقاء کے لئے جان تک لڑا دیں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ وہ فضلِ ایزدی ہے جو ہر اس قوم کو نصیب ہو سکتا ہے جو اسے حاصل کرنا چاہے۔ یاد رکھو! اللہ کا قانون زندگی کی خوشحالیوں اور کشادگیوں کا حامل ہے اور ہر قوم کے اعمال سے باخبر۔

ایک ضروری وضاحت

طلوعِ اسلام میں رشتوں کی بابت جو اشتہارات شائع ہوتے رہتے ہیں اُن کی حیثیت ایک اشتہار ہی کی ہوتی ہے۔ ذاتی طور پر ادارہ کو ان کے متعلق یا تو کوئی علم ہی نہیں ہوتا۔ اور اگر کچھ علم ہوتا ہے تو یونہی سطحی سا جو شنید پر مبنی ہوتا ہے

ان حالات میں ادارہ ان رشتوں کی بابت فریقین میں سے کسی کو بھی کوئی مفید مشورہ دینے کے قابل نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی بابت کوئی ذمہ داری لے سکتا ہے

ناظم

لاہور میں سپیئر پارٹس کی مشہور دکان

سٹینڈرڈ آٹو موبائلز

پر تشریف لائیے۔

ڈیلرز:۔ موٹر پارٹس

ٹرک (ڈیزل) پارٹس

سپیشلسٹ:۔ ڈاج۔ بیڈفورڈ۔ لی لینڈ۔

ٹی۔ایل۔ایم سی

۱۳۵۔بادامی باغ۔ ٹیلیفون 69012 لاہور

باب المراسلات

جہیز کے متعلق قانون

ایک صاحب کا استفسار ہے کہ سنا ہے جہیز کے متعلق کوئی قانون زیرِ غور ہے۔ اس کی شرعی حیثیت کیا ہے اور کیا قانون کی رُو سے اس کی وہ خرابیاں دور ہو سکیں گی جن کی وجہ سے آجکل غریب والدین سخت ضیق میں مبتلا رہتے ہیں۔

طلوعِ اسلام

جہیز کے متعلق مذکورہ قانون یا اس کا مسودہ ہماری نظر سے نہیں گذرا اس لئے اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ البتہ اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کریم میں اس کے متعلق کچھ نہیں آیا۔ یہ محض ایک رسم ہے۔ اسے ہم نے ہندوؤں کی دیکھا دیکھی اپنے ہاں رائج کر لیا۔ ہندو دھرم میں لڑکی کو وراثت میں حصہ نہیں ملتا۔ اس لئے لڑکی کو گھر سے رخصت کرتے وقت اس کے ماں باپ اسے کچھ دے دیتے تھے جسے "کنیا دان" یا لڑکی کے لئے خیرات کہا جاتا تھا۔ ہمارے ہاں غالباً وہیں سے یہ رسم آئی ہے۔ قرآن کریم میں اس کے برعکس مرد کے لئے ضروری ہے کہ وہ نکاح کے وقت اپنی ہونے والی بیوی کو کوئی تحفہ دے۔ اسے مہر کہا جاتا ہے۔ لڑکی والوں سے کچھ لینے کا تصور ہی قرآن میں نہیں۔

مروجہ جہیز کی ایک شکل تو یہ ہے کہ ایک باپ برضا و رغبت، اپنی بیٹی کو گھر سے وداع کرتے وقت بکمالِ محبت، کچھ دیتا ہے۔ اسے کون سا قانون روک سکتا ہے اور کون سا معاشرہ اسے معیوب قرار دے سکتا ہے؟ ؎ محبت کی رسمیں نہ ترکی نہ تازی۔

اس کی دوسری شکل وہ ہے جو ہمارے ہاں کے امراء کے ہاں رائج چلی آتی ہے یعنی وہ محض نمود و نمائش کی خاطر بیٹی کو جہیز دیتے ہیں۔ اگر اس میں کسی جبر کو دخل نہیں تو یہ بھی چنداں معیوب نہیں۔ البتہ اس سے یہ خرابی ضرور پیدا ہوتی ہے کہ ایسے لوگ جو اتنا دینے کی استطاعت نہیں رکھتے، جذبۂ منافست و مسابقت کی بنا پر قرض اٹھا کر جہیز دیتے ہیں اور اکثر و بیشتر اُجڑ جاتے ہیں۔ اس خرابی کے پیشِ نظر، بہتر ہو کہ جہیز کی نمائش روک دی جائے۔

اس کی تیسری شکل وہ ہے جو آجکل عام ہو رہی ہے۔ اور ایک طرف باعثِ تذلیلِ انسانیت اور دوسری طرف غریب والدین کے لئے تپ دق کا موجب بن رہی ہے۔ یعنی لڑکا (یا لڑکے والے) مطالبہ کرتے ہیں کہ اتنا جہیز دیا جائے تو ہم رشتہ لیتے ہیں۔ اس قسم کا مطالبہ کس قدر شرمناک ہے جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ غریب ماں باپ کی لڑکیوں کے بال گھر بیٹھے سفید ہو جاتے ہیں' اور ماں باپ بچارے ان کے غم میں کڑھ کڑھ کر مر جاتے ہیں۔ قانون اس باب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر قانون جہیز دینے والے کو مجرم قرار دیتا ہے تو یہ انتہائی زیادتی ہے۔ ذرا سوچئے کہ ایک شخص کے ہاں دو تین بیٹیاں ہیں۔ بڑی لڑکی کے لئے بڑی تلاش کے بعد مناسب رشتہ ملتا ہے لیکن لڑکے والوں کا مطالبہ ہے کہ اتنا

جہیز دو تو ہم رشتہ لیتے ہیں۔ فرمایئے وہ بیچارہ کیا کرے؟ ان کا مطالبہ پورا نہ کرے تو بیٹیوں کو گھر بٹھا رکھے؟ اس مجبوری کے عالم میں جہیز دینے والے کو مجرم قرار دینا ایسا ہی ہوگا جیسے مثلاً ایک شخص کسی کے سینے پر پستول رکھ کر اس کا بٹوہ طلب کرے۔ اور وہ اسے بٹوہ دے دے۔ اور قانون بٹوہ دینے والے کو مجرم قرار دیدے کہ تم نے بٹوہ دیا کیوں؟ اگر جہیز لینے والے کو مجرم قرار دیا جائے تو وہ جہیز کو اس شکل میں لے گا ہی کیوں جس کا قانونی ثبوت مل جائے۔ وہ نقد وصول کرے گا اور لڑکی والے بیچارے زبان تک نہیں کھول سکیں گے کہ اس سے لڑکی پھر گھر آبیٹھے گی۔ لہٰذا قانون اس کی اصلاح بھی نہیں کر سکے گا۔

یورپ میں ماں باپ اپنی لڑکی سے نابالغیت کی عمر تک تعلق رکھتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی کوئی ذمہ داری ان کے سر پر نہیں ہوتی۔ اس لئے وہاں جہیز دے کر لڑکی کے رشتے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں لڑکی اور لڑکا باہمی رضامندی سے خود شادی کر لیتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں ماں باپ کے سر لڑکی کی ذمہ داری آخری دم تک رہتی ہے۔ اس لئے لڑکی کا رشتہ ماں باپ نے کرنا ہوتا ہے۔ لڑکے والے اسی کو (EXPLOIT) کرتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ مطالبہ پیش کر دیتے ہیں۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ لڑکیاں تو کم و بیش ہر ایک کے ہاں ہوتی ہیں۔ اس لئے اپنے لڑکے کا رشتہ کرتے وقت جہیز کا مطالبہ کرنے سے وہ اتنا کیوں نہیں سوچتے کہ کل کو یہی صورت ان کے ہاں بھی پیدا ہو جائے گی جب انہیں اپنی لڑکی کا رشتہ کرنا ہوگا۔ اس کے جواب میں وہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لئے تو یہ صورت ایک دن پیدا ہونی ہے۔ ہم دوسروں سے اتنا کچھ کیوں نہ لے لیں جو اپنی لڑکی کو دے سکیں۔ آپ نے دیکھا کہ جب کوئی برائی معاشرہ میں عام ہو جاتی ہے تو وہ کس طرح دائرۃ السوء (VICIOUS CIRCLE) کی شکل اختیار کر لیتی ہے؟

ان خرابیوں کی اصلاح قانون کے ذریعے نہیں ہو سکتی۔ ان کی اصلاح صحیح تعلیم کی رو سے ہو سکتی ہے۔ لڑکوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے ہو کہ وہ اس قسم کے مطالبہ کو اپنے لئے باعثِ ننگ تصور کریں۔ اور شادی کو زندگی کا ایک مقدس فریضہ سمجھ کر باہمی مودت و محبت کی بنا پر اس رشتہ کو استوار کریں۔ اسی سے ان میاں بیوی کی زندگی بھی فردوس بداماں ہوگی اور ان دو خاندانوں کے روابط بھی خوشگوار اور محکم رہیں گے۔

—— (ب) ——

ادارہ کی کتابوں کی قیمتیں

ادارہ کی طرف سے کتابوں کی جو قیمتیں مشتہر ہوتی ہیں ان میں محصول ڈاک اور پیکنگ کا خرچ شامل نہیں ہوتا۔ بذریعہ ڈاک کتابیں طلب کرنے کے والے حضرات نوٹ فرمالیں کہ ان سے کتاب کی قیمت کے علاوہ محصول ڈاک اور خرچ پیکنگ بھی لیا جائے۔ صرف وہ حضرات جو ایک سو روپے والی پیشگی سکیم کی فہرست میں شامل ہیں اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔ ان کی صورت میں محصول ڈاک اور خرچ پیکنگ ادارہ خود ادا کرے گا۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام

شاہد عادل

تفہیم القرآن مودودی صاحب جلد چہارم پر ایک نظر

تفہیم القرآن کی جلد زیر تبصرہ کی ابتدا سورت لقمان سے ہوتی ہے جنہیں اگرچہ ہمارے بعض مفسرین نے انبیائے کرام میں شمار کیا ہے لیکن عام طور پر انہیں دنیا کا عظیم دانا سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اسی نسبت سے مودودی صاحب نے اس جلد میں کچھ دانائی کی باتیں کی ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جس طرح جلد دوم میں اسلامی قانون میں اپنی مہارت دکھلاتے دکھلاتے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ایک برگزیدہ نبی حضرت یوسف علیہ السلام کی (معاذ اللہ) توہین کر ڈالی تھی اسی طرح اس جلد میں ان کی دانائی کی زد میں ایک اور برگزیدہ نبی حضرت داؤد علیہ السلام آجاتے ہیں۔ اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم ان عنوانات کو شامل نہیں کرتے جن کی تفصیلات پچھلے تبصروں میں گزر چکی ہیں۔ اگر کوئی صاحب ضرورت محسوس کریں تو وہ طلوع اسلام کے متعلقہ شمارے دیکھ لیں۔

موسیقی کے شرعی احکام

سورۂ لقمان کی چھٹی آیت وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ ..... (اور انسانوں ہی میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو کلام دلفریب خرید کر لاتا ہے) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

> لہو الحدیث کی یہی تفسیر بکثرت صحابہ و تابعین سے منقول ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ سے پوچھا گیا۔ اس آیت میں لہو الحدیث سے کیا مراد ہے؟ انہوں نے تین مرتبہ زور دے کر فرمایا هُوَ وَاللّٰهِ الْغِنَاءُ۔ خدا کی قسم! اس سے مراد گانا ہے (ابن جریر، ابن ابی شیبہ، حاکم، بیہقی) اسی سے ملتے جلتے اقوال حضرات عبداللہ بن عباسؓ جابرؓ بن عبداللہ، مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیرؒ، حسن بصریؒ اور مکحول سے مروی ہیں۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم، اور ترمذی نے حضرت ابو امامہؓ باہلی کی یہ روایت نقل کی ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لا يحل بيع المغنيات ولا شراؤهن ولا التجارة فيهن ولا اثمانهن۔ مغنیہ عورتوں کا بیچنا اور خریدنا اور ان کی تجارت کرنا حلال نہیں ہے اور نہ ان کی قیمت لینا حلال ہے۔ (صفحہ ۹)

جہاں تک اس آیت کے ترجمے کا تعلق ہے وہ تو مودودی صاحب نے ٹھیک کیا ہے۔ لیکن تفسیر میں چونکہ ایک دوسرے موضوع کی طرف نکل کر اس سے موسیقی کی حرمت مراد لیتے ہیں۔ اس لئے ہم اس کے متعلق کچھ عرض کریں گے۔

اس بارے میں جیسا کہ مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے مودودی صاحب نے زیادہ تر احادیث سے استدلال کیا ہے۔ اس لئے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان احادیث کی حیثیت کیا ہے۔ قارئین حیران ہوں گے کہ جن احادیث کا سہارا

سے کہ مودودی صاحب ایک جائز چیز کو حرام قرار دے رہے ہیں۔ ائمہ حدیث کے نزدیک وہ تمام کی تمام ناقابلِ اعتبار ہیں۔ امام ابن حزم فرماتے ہیں۔

قال ابن حزم انہ لا یصح فی الباب حدیث ابداً وکل ما فیہ موضوع۔

(نیل الاوطار۔ جلد ۸ ۔ صفحہ ۱۰۰)

امام ابن حزم فرماتے ہیں کہ موسیقی کی حرمت کے بارے میں ایک حدیث بھی صحیح نہیں ہے۔ اور اس بارے میں جتنی احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ سب جھوٹی ہیں۔

یہ صرف امام ابن حزم کا مسلک ہی نہیں بلکہ دیگر ائمہ حدیث کی بھی یہی رائے ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنی کتاب مدارج النبوۃ جلد اول صفحہ ۵۰۲ پر فرماتے ہیں۔

ایک مسلک تو فقہا رکھتے ہیں جو غنا اور مزامیر کے سخت منکر ہیں۔ اور اس معاملے میں تعصب اور عناد کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ بلکہ اس فعل کو گناہِ کبیرہ اور اس کے جواز کے عقیدہ کو کفر و زندقہ اور الحاد سمجھتے ہیں۔ فقہا کا یہ طرزِ عمل زیادتی ہے اور اعتدال اور انصاف کے مسلک سے باہر ہے۔ دوسرا مسلک محدثین کا ہے جو کہتے ہیں کہ تحریم غنا کے متعلق کوئی صحیح حدیث یا نص صریح موجود نہیں اور جو کچھ ہے تو وہ یا موضوع ہے یا ضعیف۔

علامہ شوکانی کی تحقیق

مودودی امام شوکانی کی تحقیق کے بڑے گرویدہ ہیں۔ انہوں نے موسیقی کے شرعی جواز کے بارے میں ایک مستقل کتاب تصنیف فرمائی ہے جس کا نام "ابطال دعوی الاجماع فی تحریم مطلق السماع" ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۱۸۱، ۱۸۲ پر انہوں نے اپنی تحقیق کا جو نتیجہ پیش کیا ہے، اس کا اردو ترجمہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

سماع اور مزامیر کی حرمت کے متعلق بہت سی روایات ہیں جنہیں بعض علماء مثلاً ابن حزم، ابن طاہر، ابن ابی الدنیا، ابن حمدان اور امام ذہبی وغیرہم نے اپنی کتابوں میں یکجا کیا ہے۔ ان میں زیادہ تر روایات وہ ہیں جو موسیقی کی ممانعت سے متعلق ہیں۔ ان تمام احادیث کا جواب ان علماء نے دیا ہے جو اسے جائز سمجھتے ہیں۔ چنانچہ کمال الدین ادفوی اپنی کتاب الامتاع میں لکھتے ہیں کہ ظاہریہ، مالکیہ، حنابلہ، شافعیہ، ہر ایک میں سے ایک جماعت نے ان تمام احادیث کو ضعیف قرار دیا ہے جو موسیقی کی حرمت کے بارے میں وارد ہوئی ہیں۔ ان روایات کو ائمہ اربعہ، داؤد ظاہری اور سفیان ثوری میں سے کسی نے حجت تسلیم نہیں کیا۔ حالانکہ یہ لوگ مجتہدین کے سرخیل ہیں اور ان کے مذاہب کے بے شمار پیروکار موجود ہیں۔ ابوبکر ابن العربی نے بھی اپنی کتاب "احکام الاحادیث" میں ان روایا کا ذکر کر کے انہیں ضعیف قرار دیا ہے اور کہتے ہیں کہ موسیقی اور مزامیر کی حرمت کے متعلق جس قدر روایات ہیں ان میں سے ایک بھی صحیح نہیں۔"

ابن طاہر تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ان روایات کا ایک لفظ بھی صحیح نہیں۔ علاؤ الدین اپنی شرح تصوف میں ابن حزم کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ اس بارے میں کوئی حدیث بھی صحیح نہیں۔ اگر کوئی حدیث صحیح ہوتی تو ہم سب سے پہلے اسے مانتے۔ لیکن حالت یہ ہے کہ اس بارے میں جتنی احادیث موجود ہیں وہ سب کی سب موضوع ہیں۔ بلکہ ابن حزم نے اس بات پر قسم کھائی۔

ان تفصیلات کو سامنے لانے سے ہمارا مقصد یہ بتانا ہے کہ جب ضعیف اور جھوٹی احادیث مودودی صاحب کے

مفید مطلب ہوں تو وہ ان پر بلا جھجک اپنی تحقیق کی بنیادیں اٹھاتے چلے جاتے ہیں اور چاہے سارے ائمہ حدیث ان احادیث کو ضعیف ہی کیوں نہ قرار دے دیں وہ انہیں خاطر میں نہیں لاتے لیکن جب انہی ائمہ حدیث کا کوئی کمزور سا قول بھی انہیں اپنے مفید مطلب مل جائے تو پھر انہیں ائمہ کے گن گائے جاتے ہیں۔

طلاق کا اختیار

سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر ۴۹ ۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِن قَبْلِ أَن تَمَسُّوهُنَّ .... (اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرو اور پھر انہیں لگانے سے پہلے طلاق دے دو) کی تفسیر کے ذیل میں جو نکات بیان کئے گئے ہیں ان میں سے اہم ترین نکتہ طلاق کے اختیار کے متعلق ہے۔ اس بارے میں صاحب تفہیم القرآن یوں فرماتے ہیں۔

> قرآن کے اس ارشاد سے صاف طور ظاہر ہوتا ہے کہ طلاق کے نفاذ کو کسی پنچایت یا عدالت کی اجازت کے ساتھ معلق کرنا خلاف تشریع کی حکمت و مصلحت کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ اس صورت میں "بھلے طریقے سے رخصت کرنے" کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ بلکہ مرد نہ بھی چاہے تو عورت کا فضیحتی اور بدنامی اور رسوائی ہو کر رہتی ہے۔ علاوہ بریں آیت کے الفاظ میں اس امر کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہے کہ مرد کا اختیار طلاق کسی پنچایت یا عدالت کی اجازت کے ساتھ مشروط ہو۔ آیت بالکل صراحت کے ساتھ ناکح کو طلاق کا اختیار دے رہی ہے اور اسی پر یہ ذمہ داری ڈال رہی ہے کہ اگر وہ ہاتھ لگانے سے پہلے عورت کو چھوڑنا چاہے تو لازماً نصف مہر دے کر یا اپنی حیثیت کے مطابق کچھ مال دے کر چھوڑے۔ اس سے آیت کا مقصود صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ طلاق کو کھیل بننے سے روکنے کے لئے مرد پر مالی ذمہ داری کا ایک بوجھ ڈال دیا جائے تاکہ وہ خود ہی اپنے اختیار طلاق کو سوچ سمجھ کر استعمال کرے اور دو خاندانوں کے اندرونی معاملے میں کسی بیرونی مداخلت کی نوبت نہ آنے پائے بلکہ شوہر سرے سے کسی کو یہ بتانے پر مجبور ہی نہ ہو کہ وہ بیوی کو کیوں چھوڑ رہا ہے۔ (صفحہ ۱۱۱)

اس طرح جناب مفسر صاحب اس آیت میں "جمع کے صیغے" کو گول کر گئے ہیں کہ جس میں خطاب مسلمانوں یعنی ان کی ہیئت حاکمہ سے ہے اور بڑی آسانی سے ایک اجتماعی مسئلہ کو انفرادی مسئلہ بنا دیا ہے۔ شاید ہم پر یہ اعتراض ہو کہ ہمیں جو "جمع کا صیغہ" نظر آرہا ہے کیا وہ پاکستان کے اتنے بڑے مفسر کو نظر نہیں آسکتا تھا؟ تو اس بارے میں عرض ہے کہ انہیں بھی یہ "جمع کا صیغہ" اچھی طرح نظر آتا تھا۔ لیکن عائلی قوانین کے نفاذ سے پہلے بلکہ اس وقت تو انہوں نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب "حقوق الزوجین" تصنیف فرمائی تھی جس کا شمار ان کی معرکۃ الآرا تصانیف میں ہوتا ہے۔ اس میں انہوں نے مرد کے طلاق کے اختیار کو انفرادی کی بجائے اولی الامر کا معاملہ قرار دیا تھا۔ ملاحظہ فرمایئے:

> اگر اس کی (یعنی عورت کی) شکایت جائز ثابت ہوگی تو قانون کے نافذ کرنے والوں یعنی اولی الامر کو حق ہوگا کہ شوہر کو اس کے اختیار سے محروم کر کے بطور خود اس اختیار کو استعمال کریں۔ قاضی کو فسخ اور تفریق اور تطبیق کے جو اختیارات شرع میں دیئے گئے ہیں، وہ اسی اصول پر مبنی ہیں۔ فقہا کی ایک جماعت نے بیدہ عقدۃ النکاح سے یہ استدلال کیا ہے کہ طلاق کا جو اختیار مرد کو دیا گیا ہے وہ کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں۔ اور اس قاعدہ میں کوئی استثنا نہیں۔ اور اگر مرد طلاق دینے پر راضی نہ ہو تو کسی حال میں قاضی کو یہ اختیار نہیں ہے کہ اس اختیار کو خود اپنے ہاتھ میں لے کر استعمال کریں۔ لیکن قرآن بھی اس

استدلال کی تائید نہیں کرتا۔ (حقوق الزوجین۔ طبع ششم۔ صفحہ ۱۰۸)

اپنی اسی کتاب میں مودودی صاحب نے عائلی قوانین میں اصلاح کا مطالبہ کرتے ہوئے مصری عائلی قوانین کی طرز پر سفارشات پیش کی تھیں۔ ۱۹۶۱ء میں کم و بیش انہی خطوط پر عائلی قوانین کا نفاذ عمل میں آیا۔ لیکن نامعلوم وجوہات کی بنا پر مودودی صاحب نے ان کی مخالفت کی اور ان کی تفسیر کی زیرِ تبصرہ جلد اسی دوران شائع ہوئی۔ چنانچہ عائلی قوانین کے نفاذ سے پہلے قرآن مجید جس استدلال کی تائید نہیں کرتا تھا وہی استدلال نہ صرف یہ کہ عین قرآنی ہو گیا بلکہ اگر کوئی صاحب غلطی سے ان کے حقوق الزوجین والے استدلال کی طرف اشارہ کر دیے تو انہیں ڈانٹ دیا جاتا ہے کہ یہ خدائی تشریع کی حکمت و مصلحت کے خلاف ہے۔ (صفحہ ۱۱)۔ آپ نے غور فرمایا کہ قرآن پاک کا مفہوم کس طرح مصلحتوں کے ماتحت بدلا جاتا ہے۔

غلامی کے رتبے کی بلندی

غلامی کے بارے میں صاحب تفسیر کے تحقیق خیالات پچھلی جلدوں کے تبصروں میں گذر چکے ہیں۔ اپنے ان خیالات کی موجودگی میں سورۃ الاحزاب کے تعارف میں حضرت زیدؓ کی حضرت زینبؓ سے شادی کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کس طرح اسلام نے غلاموں کا رتبہ بلند کر دیا تھا اور انہیں عرب کے شرفاء کے برابر لے آیا فرماتے ہیں۔

> حضرت زینبؓ حضورؐ کی پھوپھی زاد بہن تھیں بچپن سے جوانی تک اُن کی ساری عمر آپ کے سامنے گذری تھی۔ کسی وقت ان کو دیکھ کر عاشق ہو جانے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ پھر آپ نے خود اصرار کر کے حضرت زیدؓ سے ان کا نکاح کرایا تھا۔ ان کا سارا خاندان اس پر راضی نہ تھا کہ قریش کے اتنے اونچے گھرانے کی لڑکی ایک آزاد کردہ غلام سے بیاہی جائے۔ خود حضرت زینبؓ بھی اس رشتے سے ناخوش تھیں مگر حضورؐ کے حکم سے سب مجبور ہو گئے اور حضرت زیدؓ کے ساتھ ان کی شادی کر کے عرب میں اس امر کی پہلی مثال پیش کر دی گئی کہ اسلام ایک آزاد کردہ غلام کو اٹھا کر شرفائے قریش کے برابر لے آیا ہے۔ (صفحہ ۶۴ - ۶۵)

ہمیں صاحب تفسیر کے اس استدلال سے سو فیصد اتفاق ہے کہ اسلام نے غلاموں کا رتبہ بلند کر کے سرے سے غلامی ہی کو ختم کر دیا۔ لیکن مودودی صاحب دوسرے مقامات پر ان غلاموں کی مستورات کے ساتھ شریعت کے پردے میں جو سلوک روا رکھتے ہیں اس کی جھلکیاں پہلی جلدوں کے تبصروں میں گذر چکی ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ اس جدید زمانے میں جبکہ ساری دنیا سے یہ لعنت ختم ہو چکی ہے، اسے جائز سمجھتے ہیں بلکہ ان کی عورتوں سے بغیر نکاح کے مباشرت کی اجازت دیتے ہیں اور اس مقصد کے لئے تعداد کی بھی کوئی قید نہیں جتنی جی چاہے خرید لو اور جب جی بھر جائے بیچ ڈالو۔ انہی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

> یہ آیت اس امر کی صراحت کر رہی ہے کہ منکوحہ بیویوں کے علاوہ مملوکہ عورتوں سے بھی تمتع کی اجازت ہے اور ان کے لئے تعداد کی کوئی قید نہیں ہے۔ اس مضمون کی تصریح سورۃ نساء آیت ۳، سورۃ مومنون آیت ۶ اور سورۃ معارج آیت ۳۰ میں بھی کی گئی ہے۔ ان تمام آیات میں مملوکہ عورتوں کو منکوحہ ازواج کے بالمقابل ایک الگ صنف کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے اور پھر ان کے ساتھ ازدواجی تعلق کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ نیز سورۃ نساء کی آیت ۳ منکوحہ بیویوں کے لئے چار کی حد مقرر کرتی ہے مگر نہ اس جگہ اللہ تعالےٰ نے مملوکہ عورتوں کے لئے تعداد کی حد مقرر کی ہے اور نہ دوسری متعلقہ آیات میں ایسی کسی حد کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ بلکہ یہاں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ کے لئے اس کے بعد دوسری عورتوں سے نکاح

کرنا یا موجودہ بیویوں میں سے کسی کو طلاق دے کر دوسری بیوی لانا تو حلال نہیں ہے' البتہ مملوکہ عورتیں حلال ہیں۔
اس سے صاف ظاہر ہے کہ مملوکہ عورتوں کے معاملے میں کوئی حد مقرر نہیں ہے۔" (صفحہ ۱۱۸، ۱۱۹)

حالانکہ قرآن مجید میں اس بارے میں بڑے واضح احکام ہیں کہ انہیں زوجیت میں لانے کے لئے ان سے نکاح کرنا ہوگا۔ اور یہ بھی اس وقت جب ایک آزاد عورت سے نکاح کی استطاعت نہ ہو۔ فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَةً اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ۔ (النساء۔ ۳) اور جب تمہیں خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک آزاد عورت یا لونڈی سے نکاح کر لو۔ دوسرے مقام پر اسی مضمون کو دہراتے ہوئے (کہ اگر آزاد عورت سے نکاح کی استطاعت نہ ہو تو لونڈی سے نکاح کر لو) کے آخر میں فرمایا۔ فَانۡكِحُوۡهُنَّ بِاِذۡنِ اَهۡلِهِنَّ۔ (ان کے مالکوں سے اجازت لے کر ان سے نکاح کرو)۔ اب جبکہ مودودی صاحب لونڈیوں کو بغیر نکاح کے مالکوں کی بیویاں قرار دے چکے ہیں تو کون سا ایسا بے وقوف مالک یا بے غیرت خاوند ہوگا جو اپنی بیویوں کا دوسروں سے نکاح کی اجازت دے گا اور خود کو مودودی صاحب کی عطا کردہ "نعمت تمتع" سے محروم کرے گا۔[1]

ان تفصیلات کے ساتھ اگر ہم نے دنیا کے سامنے یہ دعوےٰ کیا کہ اسلام نے غلامی کا رتبہ بلند کر دیا تھا تو دنیا جس نظر سے ہمیں دیکھے گی اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

تعددِ ازواج

تعدد ازواج کا ذکر پچھلی اقساط میں بھی گذر چکا ہے یہاں سورۃ الاحزاب کی پچاسویں آیت يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَحۡلَلۡنَا لَكَ اَزۡوَاجَكَ الّٰتِيۡۤ اٰتَيۡتَ اُجُوۡرَهُنَّ۔۔ (اے نبی! ہم نے تمہارے لئے حلال کر دیں' تمہاری وہ بیویاں جن کے مہر تم نے ادا کئے ہیں) کے ذیل میں ازواج المطہرات کا ذکر فرماتے ہوئے تعدد ازواج کے متعلق بھی یوں اشارہ کر جاتے ہیں:۔

اس بیان سے اُن لوگوں کے خیال کی غلطی بھی واضح ہو جاتی ہے جو سمجھتے ہیں کہ تعدد ازدواج صرف چند خاص شخصی ضرورتوں کی خاطر ہی جائز ہے۔ اور ان کے ماسوا کوئی غرض ایسی نہیں ہو سکتی جس کے لئے یہ جائز ہو۔ ظاہر بات ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے جو ایک سے زاید نکاح کئے ان کی وجہ یہ نہ تھی کہ بیوی بیمار تھی یا بانجھ تھی' یا اولاد نرینہ نہ تھی یا کچھ یتیموں کی پرورش کا مسئلہ درپیش تھا۔ ان محدود شخصی ضروریات کے بغیر آپ نے تمام نکاح یا تو تبلیغی و تعلیمی ضروریات کے لئے کئے یا اصلاحِ معاشرہ کے لئے یا سیاسی و اجتماعی مقاصد کے لئے۔ سوال یہ ہے کہ جب اللہ نے خود تعدد ازواج کو اُن چند گنی چنی مخصوص اغراض تک جن کا آج نام لیا جا رہا ہے محدود نہیں رکھا اور اللہ کے رسول نے اُن کے سوا بہت سے دوسرے مقاصد کے لئے متعدد نکاح کئے' تو کوئی دوسرا شخص کیا حق رکھتا ہے کہ قانون میں اپنی طرف سے چند قیود تجویز کرے اور ادھر سے دعویٰ یہ کرے کہ یہ حد بندیاں وہ شریعت کے مطابق کر رہا ہے۔ دراصل ان ساری حد بندیوں کی جڑ یہ مغربی تخیل ہے کہ تعدد ازواج بجائے خود ایک برائی ہے۔ اسی تخیل کی بنا پر یہ نظریہ پیدا ہوا ہے کہ یہ فعل حرام اگر کبھی حلال ہو بھی سکتا ہے تو صرف شدید ضروریات کے لئے ہو سکتا ہے۔ اب اس درآمد شدہ تخیل پر اسلام کا جعلی ٹھپہ لگانے

---

[1] جیسا کہ متعدد بار لکھا جا چکا ہے' قرآن مجید میں جن لونڈیوں کا ذکر ہے وہ' وہ ہیں جو زمانہ نزولِ قرآن میں عرب معاشرہ میں موجود تھیں۔ اس کے بعد غلام اور لونڈیاں بنانے کی قطعاً اجازت نہیں رہی تھی۔　　(طلوعِ اسلام)

کی جا سکے کتنی ہی کوشش کی جائے۔ قرآن و سنت اور پوری امتِ مسلمہ کا لٹریچر اس سے قطعاً ناآشنا ہے۔

(صفحہ ۱۲۶، ۱۲۷)

قارئین حیران ہوں گے کہ اپنی تحریر سے صرف ایک صفحہ پہلے مودودی صاحب حضور صلعم کی شادیوں کو آپؐ کی خصوصیت قرار دینے پر دلائل کے انبار لگا چکے ہیں۔ مودودی صاحب نے تعدد ازواج کی کھلی چھٹی دینے کے بارے میں اُمت مسلمہ کے لٹریچر کا جس طرح حوالہ دیا ہے اس کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ اس تعدد ازواج والی آیت کی اتنی متضاد تفسیریں کی گئی ہیں کہ ان کو سامنے رکھتے ہوئے نواب صدیق حسن خان صاحب نے اپنی مشہور تفسیر فتح البیان کی جلد دوم کے صفحہ ۱۶۸ پر یہ فیصلہ دیا ہے کہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ چار سے زیادہ بیویوں کی حرمت کا استدلال حدیث سے کیا جائے نہ کہ قرآن مجید سے اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ جس حدیث سے تعدد ازواج ثابت کیا جاتا ہے، ائمہ حدیث کے نزدیک سرے سے وہ اعتبار کے ہی قابل نہیں۔ (ملاحظہ ہو نیل الاوطار۔ جلد ۶ صفحہ ۱۵۰)۔ تعدد ازواج کی مخالفت میں ائمہ کا مسلک ہم پہلی جلد کے تبصرے میں پیش کر چکے ہیں۔ یہاں ہم حضور صلعم کا وہ عمل پیش کرتے ہیں جس میں آپ نے غیر مشروط تو کیا سرے سے دوسری شادی کرنے کی اجازت تک نہ دی۔ جب آپ سے حضرت فاطمہؓ کی موجودگی میں حضرت علیؓ کے نکاح ثانی کے لئے اجازت کی درخواست کی گئی تو آپ نے منبر نبویؐ پر رونق افروز ہو کر فرمایا۔

(ترجمہ) حضرت مسور بن مخرمہؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بنی ہشام بن مغیرہ نے مجھ سے اس بارے میں اجازت چاہی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح علیؓ ابن ابی طالب سے کر دیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ ہاں اگر علیؓ چاہتے ہیں تو میری بیٹی کو طلاق دے دیں اور ان کی بیٹی سے نکاح کر لیں۔ میری بیٹی میرا جگر گوشہ ہے۔ جو چیز اسے تکلیف پہنچاتی ہے وہ مجھے بھی پہنچاتی ہے۔ اور جو چیز اس کے لئے باعثِ ایذا ہے وہ میری ایذا کا سبب ہے۔

(صحیح بخاری۔ باب ذب الرجل عن ابنتہ فی الغیرۃ والانصاف)

ویسے تو صحیح بخاری کو کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب کا درجہ دیا جاتا ہے لیکن جب اس کی کوئی حدیث مفید مطلب نہ ہو تو اسے عام طور پر گول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس لئے ہم اس کے ساتھ یہ بھی وضاحت کئے دیتے ہیں کہ محدثین نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو فتح الباری شرح صحیح بخاری جلد نہم صفحہ ۱۸۷)

کیا مودودی صاحب کو قرآن و سنت اور امتِ مسلمہ کے لٹریچر میں یہ چیزیں نظر نہیں آئیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔

پردہ کی قانونی حیثیت

پردے کی شرعی حیثیت کے بارے میں بحث پچھلی قسط میں بیان ہو چکی ہے۔ یہاں اس کی جو حکمت بیان کی گئی ہے، اس کے بارے میں یہ دیکھنا ہے کہ اس کی فقہی حیثیت کیا ہے۔ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ ۔ (الاحزاب۔ ۵۹)۔ (اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں) کے تحت پردہ کے شرعی احکامات کی جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ ان کی حکمت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"پہچان لی جائیں" سے مراد یہ ہے کہ ان کو سادہ اور حیادار لباس میں دیکھ کر ہر دیکھنے والا جان لے کہ وہ شریف اور باعصمت عورتیں ہیں، آوارہ اور کھلاڑی (؟) نہیں ہیں کہ کوئی بدکردار انسان ان سے اپنے دل کی تمنا

پوری کرنے کی امید کرسکے۔ (صفحہ ۱۳۱)

صاحبِ تفسیر نے مختلف مقامات پر شرعی پردے کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے لیکن یہ کہیں نہیں بتایا کہ اس کی فقہی حیثیت کیا ہے۔ یعنی یہ فرض ہے یا مستحب۔ کیونکہ فقہاء کے ہاں اس پر جو بحثیں ملتی ہیں اس سے تصویر کا بالکل دوسرا رُخ سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً ہماری فقہ کی کتابوں میں یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی لونڈی پردہ تو کجا صرف سر ڈھانپنے کی کوشش کرے تو اس کا دوپٹہ زبردستی کھینچ لو اور اس کے لئے حضرت عمرؓ کا یہ عمل پیش کیا جاتا ہے۔ اَلْقِیْ عَنْکِ الْخِمَار یا دفار، اَتَشَبَّهِیْنَ بِالْحَرائِر۔ اے دفار (لونڈی کا نام) اپنی اوڑھنی اتار دے۔ کیا تو آزاد عورتوں کی مشابہت اختیار کرتی ہے؟ (ہدایہ اولین مجیدی صفحہ ۴۹۹)۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پردے کے احکام صرف آزاد عورتوں کے لئے تھے اور لونڈیوں کو چونا اوڑھنیوں کے بغیر پھرنے کا حکم دیا جا رہا ہے تو اس لئے کہ بدکردار انسانوں کو اپنی دل کی تمنا پوری کرنے کی کھلی چھٹی ہو؟

فوٹو اور تصویر کی شرعی حیثیت

شریعت نے جن مقاصد کے لئے تصاویر وغیرہ کو حرام قرار دیا ہے یعنی یہ کہ کسی مذہبی شخصیت کے عقیدت مند اس کی تصویر کی پرستش نہ کرنے لگ جائیں۔ تو اس کی تو پوری پوری خلاف ورزی ہو چکی ہے اور مودودی صاحب سمیت ہر مذہبی شخصیت کے عمدہ سے عمدہ فوٹو نہ صرف تیار ہو چکے ہیں بلکہ روزانہ اخباروں میں بھی آتے رہتے ہیں۔ اب رہ جاتا ہے تعلیمی افادیت کے لئے تصاویر کا استعمال تو اسے حرام قرار دے دیا جاتا ہے۔ چنانچہ سورۂ سبا کی آیت یَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا یَشَآءُ مِنْ مَّحَارِیْبَ وَ تَمَاثِیْلَ۔ (وہ اس کے لئے بناتے تھے جو وہ چاہتا تھا' اونچی عمارتیں اور مجسمے) کی تفسیر کی ذیل میں مودودی صاحب بہت سی احادیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

> اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں تصاویر کی حرمت کوئی مختلف فیہ یا مشکوک مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے صریح ارشادات' صحابہ کرام کے عمل اور فقہائے اسلام کے متفقہ فتاویٰ کی رو سے ایک مسلّم قانون ہے جسے آج بیرونی ثقافتوں سے متاثر لوگوں کی موشگافیاں بدل نہیں سکتیں۔ (صفحہ ۱۸۷)

آیت زیرِ تفسیر میں تمثال کا جو لفظ استعمال ہوا ہے، عربی لغت میں اس کے معنے صرف مجسمے کے ہیں یا زیادہ مفصل الفاظ میں التمثال اسم للشیء المصنوع مشبها بخلق من خلق اللہ۔ (لسان العرب) تمثال نام ہے ہر اس مصنوعی چیز کا جو خدا کی کسی مخلوق کے مانند بنائی گئی ہو۔ لیکن مودودی صاحب اس میں تمثال کا ترجمہ مجسمہ کی بجائے تصویر کر دیتے ہیں۔ تصویر بھی عربی ہی کا لفظ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی مراد محض تصویر ہی تھی تو اس کی بجائے تمثال کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا ہے۔ سوچنے کی بات ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود صاحبِ تفسیر کی اس تاویل سے اپنی تسلی بھی نہیں ہوتی۔ اسی لئے وہ اس بارے میں بہت سی احادیث پیش کرتے ہیں۔ ان احادیث میں ایک ٹکڑا بار بار آیا ہے۔ کہ لَا تَدْخُلُ الْمَلٰٓئِکَةُ بَیْتًا فِیْهِ صُوْرَةٌ۔

---

[1] ہفتہ وار اخبار المنبر نے اپنی ۱۵ اکتوبر ۱۹۶۶ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ جماعت اسلامی کے کارکن مودودی صاحب کے دوروں کا تصویری البم تیار کرتے ہیں۔ اور انہیں اس سے نہ کبھی مودودی صاحب نے روکا ہے نہ اس جماعت کے مرکز نے۔ (طلوعِ اسلام)

(تصویروں والے گھر میں فرشتے داخل نہیں ہوتے) لیکن جن احادیث میں اس "ٹکڑے" کے بارے میں وضاحت ہے ان کا نام بھی نہیں لیتے۔ ہم صحیح بخاری کے باب اِذَا قَالَ اَحَدُکُمْ آمین۔ (جلد ۲ صفحہ ۱۱۰) سے حضرت بسر بن سعید کی روایت کردہ حدیث کا ترجمہ پیش کرتے ہیں کہ زید بن خالد الجہنی نے ان سے یہ حدیث بیان کی اور بسر بن سعید کے ساتھ عبیداللہ الخولانی بھی تھے جنہوں نے ام المومنین حضرت میمونہؓ کی گود میں پرورش پائی تھی۔ زید بن خالد نے کہا کہ ان سے ابوطلحہ نے بیان کیا کہ رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس گھر میں تصاویر ہوتی ہیں اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔ بسر فرماتے ہیں کہ زید بن خالد بیمار ہوئے تو ہم اس کی عیادت کے لئے گئے۔ ہم کیا دیکھتے ہیں کہ خود ان کے گھر میں ایک پردہ پر تصاویر ہیں تو میں نے عبید خولانی سے کہا کہ انہوں نے تو ہمیں حرمتِ تصویر کے متعلق حدیث بیان کی تھی۔ جواب ملا کہ کیا تم نے نہیں سنا تھا کہ کپڑے کی تصاویر اس سے مستثنیٰ ہیں۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ نہیں، انہوں نے اس کا ذکر کیا تھا۔"

دراصل تصاویر کی حرمت کے بارے میں سارے اقوال کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شریعت بت سازی کے خلاف ہے۔ کیونکہ اکثر علماء نے ایسی تصاویر کو جن کا سایہ نہیں ہوتا جیسا کہ فوٹو وغیرہ جائز قرار دیا ہے۔ امام شوکانی فرماتے ہیں:۔

وقال بعض السلف انّما یَنْھیٰ عما کَانَ لہٗ ظِلٌّ۔ ولا باس بالصُّوَرِ الّتی لیس لھا ظِلٌّ۔ (نیل الاوطار۔ جلد ۲۔ صفحہ ۱۰۵)

(ترجمہ) بعض سلف صالحین فرماتے ہیں کہ صرف وہی تصویر ناجائز ہے جس کا سایہ ہو۔ اور جس تصویر کا کوئی سایہ وغیرہ نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

علمائے احناف کا مسلک بھی اسی کے قریب قریب ہے۔ اسے ہم مودودی صاحب کی تصریح کے مطابق فقہ کی نفیس ترین کتاب "الفقہ علی المذاہب الاربعۃ" سے نقل کرتے ہیں۔

قالوا تصویر غیر الحیوان من شجرۃٍ ونحوہٖ جائزٌ۔ اما تصویر الحیوانِ فان کان علی بساطٍ او وسادۃٍ او ثوبٍ مفروشٍ او ورقٍ فانہٗ جائزٌ لان الصورۃ فی ھذہ الحالۃ تکون ممتھنۃً وکذالک یجوز اذا کانت الصورۃ ناقصۃ عضوًا لا یمکن ان تعیش بدونہٖ کالراس ونحوھا۔ (جلد دوم صفحہ ۵۲)

(ترجمہ) غیر جاندار اشیاء مثلاً درخت وغیرہ کی تصویر جائز ہے۔ اور اگر جاندار اشیاء کی تصاویر چٹائی، تکیہ، دری یا کاغذ وغیرہ پہ ہوں تو جائز ہیں کیونکہ ان حالتوں میں تصویر کے احترام کی کوئی گنجائش نہیں۔ اسی طرح ایسی تصاویر جن میں کوئی ایسا عضو نہ ہو جس کے بغیر جاندار زندہ نہ رہ سکتا ہو مثلاً سر وغیرہ تو ایسی تصویر بھی جائز ہے۔

کیا کاغذ کی تصویر فوٹو کی واضح اجازت پر دلالت نہیں کرتی!

مشروبِ جنت کو شراب قرار دینا

سورۃ الصّٰفّٰت کی آیت ۴۵۔ یُطَافُ عَلَیْھِمْ بِکَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے۔ "شراب کے چشموں سے ساغر بھر بھر کر ان

کے درمیان پھرائے جائینگے۔ اس آیت میں کوئی ایسا لفظ نہیں جس کا ترجمہ شراب کیا جا سکے۔ لیکن مودودی صاحب اسے اپنی طرف سے زیادہ کر دیتے ہیں اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں۔

"اصل میں یہاں شراب کی تصریح نہیں ہے بلکہ صرف کاس (ساغر) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن عربی زبان میں کاس کا لفظ بول کر ہمیشہ شراب ہی مراد لی جاتی ہے۔ جس پیالے میں شراب کی بجائے دودھ یا پانی ہو۔ یا جس پیالے میں کچھ نہ ہو اسے کاس نہیں کہتے۔ کاس کا لفظ صرف اسی وقت بولا جاتا ہے جب اس میں شراب ہو۔

(صفحہ ۲۸۶)

مودودی صاحب جب اس طرح کی ہمہ دانی کے دعوے کے ساتھ غلط استدلال کرتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے۔ شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی طرح دوسروں کا عربی زبان کا علم بھی محدود ہوگا۔ میرے قریب ہی عربی ادب کی ایک کتاب منتخبات ادبیہ حصہ سوم پڑی تھی کھول کر دیکھا تو ایک ایسا شعر نظر آیا جس میں کاس دوسرے معانی میں استعمال ہوا تھا۔

يَسُرُّ الْقَلْبَ سَفْكُ الدَّمِ يَلَذُّ الْحَلْقَ كَاسَ السَّمِ

(ترجمہ) خون کا بہنا دل کو خوش کرتا ہے اور زہر کا پیالہ حلق کو لذیذ معلوم ہوتا ہے)

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی کہ مشروب جنت کو مودودی صاحب شراب بنانے پر کیوں مصر ہیں جبکہ شراب کے لفظ کا اضافہ کئے بغیر بھی صحیح ترجمہ ہو سکتا تھا۔

جنت کی نعمتیں

دراصل جنت کی نعمتیں کچھ ایسی ہیں کہ نہ ہی دنیا کی چیزوں سے انہیں تشبیہ دی جا سکتی ہے اور نہ ہی ان کی حقیقت تصور میں آسکتی ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ۔ (السجدہ - ۱۷) جس کا ترجمہ خود مودودی صاحب نے یوں کیا ہے۔ "اور پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزا میں ان کے لئے چھپا رکھا گیا ہے۔ اس کی کسی متنفس کو خبر نہیں ہے"۔ یہی نہیں، بلکہ احادیث کی تمام کتابوں بخاری، مسلم، ترمذی وغیرہ میں اس مضمون کی احادیث ہیں کہ أعددت لعبادي الصالحين مالا عين رأت ولا أذن سمعت ولا خطر على قلب بشر۔ (کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ کچھ فراہم کر رکھا ہے جسے نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھا نہ کبھی کسی کان نے سنا، نہ کوئی انسان کبھی اس کا تصور کر سکا ہے۔

حوروں کی حقیقت

کوئی دوسرا انسان یہ تصور نہ کر سکا ہو تو علیحدہ بات ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مودودی صاحب کی آنکھ ان نعمتوں کو دیکھ رہی ہے۔ اس لئے وہ ان کا عجیب عجیب تصور پیش کرتے ہیں۔ ان کا یہ تصور مشروب جنت کے لئے شراب کے لفظ کے اضافے تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ جنت کی حوروں کے بارے میں بھی یوں تحقیق پیش کرتے ہیں۔

بعید نہیں ہے کہ یہ وہ لڑکیاں ہوں کہ جو دنیا میں سنِ رشد کو پہنچنے سے پہلے مر گئی ہوں اور جن کے والدین جنت میں جانے کے مستحق نہ ہوئے ہوں۔ یہ بات اس قیاس کے بنا پر کہی جا سکتی ہے کہ جس طرح ایسے لڑکے اہلِ جنت کی خدمت کے لئے مقرر کر دیئے جائیں گے اور وہ ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے، اسی طرح ایسی لڑکیاں بھی اہلِ جنت کے لئے حوریں بنا دی جائیں گی۔ اور وہ ہمیشہ نوخیز لڑکیاں ہی رہیں گی[1] واللہ اعلم بالصواب۔ (صفحہ ۲۸۷)

---

[1] استغفر اللہ! اس قسم کی تفسیر کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ خدا (SAN - PERVERSION) سے بچائے۔
(طلوع اسلام)

قربانی کی سنت

قربانی کی شرعی حیثیت کے بارے میں تفصیلات پچھلی قسط میں گذر چکی ہیں۔ یہاں صاحبِ تفہیم وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ۔ (اور ہم نے ایک بڑی قربانی فدیے میں دے کر اسے چھڑا لیا) کے ذیل میں ایک نیا نکتہ رقم فرماتے ہیں۔

> اس کے علاوہ اُسے بڑی قربانی قرار دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قیامت تک کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ سنت جاری کر دی کہ اسی تاریخ کو تمام اہلِ ایمان دنیا بھر میں جانور قربان کریں اور وفاداری و جاں نثاری کے اس عظیم الشان واقعہ کی یاد تازہ کرتے رہیں[1]۔ (ص ۲۹۷)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ سنت اللہ تعالیٰ نے جاری کی تو پھر شرعاً اس کا حکم فرائض میں داخل ہونا چاہیئے کیونکہ یہ فرمانِ خداوندی ہے۔ ادھر ہمارے خلفائے راشدینؓ تھے کہ وہ صرف اس لئے قربانی نہیں کرتے تھے کہ لوگ اسے کہیں واجب نہ سمجھ لیں۔ امام شافعیؒ جو قربانی کو واجب نہیں سمجھتے، اپنے مسلک کی تائید کے لئے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا یہ عمل پیش کرتے تھے۔

> قَدْ بَلَغَنَا اَنَّ اَبَا بَکْرٍ وَعُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا کَانَا لَا یُضَحِّیَانِ کَرَاھِیَۃً اَنْ یُقْتَدٰی بِھِمَا فَیَظُنَّ مَنْ رَاٰھُمَا اَنَّھَا وَاجِبَۃٌ۔ (کتاب الاُم جلد دوم صفحہ ۱۸۹)
>
> (ترجمہ) حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما اس خدشہ سے قربانی نہیں کرتے تھے کہ کہیں لوگ ان کی پیروی میں اسے واجب نہ سمجھ لیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام پر بہتان

سورۃ صٓ میں حضرت داؤد علیہ السلام کا جو قصہ بیان ہوا ہے مفسرین نے اس کے ضمن میں ایسی ایسی اسرائیلی روایات نقل کر دی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے کسی نبی کے شایانِ شان ہرگز ہرگز نہیں۔ مودودی صاحب نے بجا طور پر ان اسرائیلی روایات پر کڑی تنقید کی ہے اور پھر اپنی طرف سے اس واقعہ کی بڑی حکیمانہ تاویل کرتے ہیں جو ان کے الفاظ میں یہ ہے۔

> اصل واقعہ جو قرآن مجید کے مذکورہ بالا بیان سے صاف سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اُوریاہ (یا جو کچھ بھی اس شخص کا نام رہا ہو) سے محض یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور چونکہ یہ خواہش ایک عام آدمی کی طرف سے نہیں بلکہ ایک جلیل القدر فرمانروا اور ایک زبردست دینی عظمت رکھنے والی شخصیت کی طرف سے رعایا کے ایک فرد کے سامنے ظاہر کی گئی تھی اس لئے وہ شخص کسی ظاہری جبر کے بغیر بھی اپنے آپ کو اسے قبول کرنے پر مجبور پا رہا تھا۔ اس موقعہ پر قبل اس کے کہ وہ حضرت داؤد کی فرمائش کی تعمیل کرتا، قوم کے دو نیک آدمی اچانک حضرت داؤد کے پاس پہنچ گئے۔ اور انہوں نے ایک فرضی مقدمے کی صورت میں یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کر دیا۔ حضرت داؤد ابتداءً تو یہ سمجھے کہ یہ واقعی کوئی مقدمہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسے سن کر اپنا فیصلہ سنا دیا۔ لیکن زبان سے فیصلہ کے الفاظ نکلتے ہی ان کی ضمیر نے تنبیہ کی۔ یہ تمثیل پوری طرح اُن کے اور اُس شخص کے معاملہ پر چسپاں ہوتی ہے اور جس فعل کو وہ ظلم قرار دے رہے ہیں اس کا صدور خود اُن سے اُس شخص کے معاملہ میں ہو رہا ہے۔ یہ احساس دل میں پیدا ہوتے ہی وہ سجدہ میں گر گئے اور توبہ کی اور اپنے اس فعل سے رجوع فرما لیا۔ (صفحہ ۳۲۸)

---

[1] اور اس طرح جماعت اسلامی کو ہر سال لاکھوں روپے کی کھالیں ملتی رہیں۔ (طلوعِ اسلام)

مودودی صاحب کی اس تفسیر سے چند ایک اہم سوال ذہن میں ابھرتے ہیں جو غور طلب ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ۔

(۱) اصل واقعہ جو قرآن مجید کے مذکورہ بالا بیان سے صاف سمجھ میں آتا ہے، یہ ہے کہ حضرت داؤدؑ نے ایک شخص سے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیدے۔ کیونکہ آپ اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کی وہ کون سی آیات ہیں جن سے یہ "اصل واقعہ صاف سمجھ میں آتا ہے"؟ کیا قرآن مجید میں کہیں بھی یہ مذکور ہے کہ حضرت داؤدؑ نے (معاذ اللہ) کسی شخص سے ایسی بات کہی تھی؟ اور اگر قرآن مجید میں کہیں یہ مذکور نہیں (جیسا کہ واضح ہے کہ اس میں کہیں اس کا ذکر نہیں آیا) تو کیا مودودی صاحب کو اس کا قطعاً خیال نہیں آیا کہ اس قسم کی بیہودہ بات کو پہلے خدا کے ایک اولوالعزم پیغمبرؑ اور پھر قرآن مجید کی طرف منسوب کرنا کتنا بڑا جرم ہے۔؟

(۲) انہوں نے کہا ہے کہ مفسرین نے اس واقعہ کے ضمن میں ایسی ایسی اسرائیلی روایات نقل کر دی ہیں جو اللہ کے کسی نبی کے شایانِ شان نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جو بات خود انہوں نے خدا کے اس جلیل القدر نبی کی طرف منسوب کی ہے، کیا وہ ایک نبی کے شایانِ شان ہے؟ خدا کا رسول تو ایک طرف، کیا کسی عام انسان کا بھی کسی دوسرے انسان سے یہ کہنا کہ میں تمہاری بیوی سے شادی کرنا چاہتا ہوں اس لئے تم اسے طلاق دے دو، قرینِ شرافت قرار دیا جائے گا؟ کیا اس بات کی سند (جو انہوں نے حضرت داؤدؑ کی طرف منسوب کی ہے) اسرائیلی روایت نہیں؟

(۳) جو کچھ مودودی صاحب نے لکھا ہے۔ اس سے واضح ہوتا کہ حضرت داؤدؑ کی حکومت میں رعایا کا یہ حال تھا کہ وہ جس شخص سے (معاذ اللہ) کہہ رہے تھے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے تاکہ یہ اس سے شادی کر سکیں، اسے جرأت نہیں تھی کہ وہ ان کے اس مطالبہ سے انکار کر سکے۔ اس کے لئے اس نے یہ تدبیر اختیار کی کہ دوسرے لوگوں کو حضرت داؤدؑ کی طرف بھیجا پھر ان لوگوں کو بھی براہ راست یہ کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ وہ اس باب میں زیادتی کر رہے ہیں۔ انہوں نے بھی اسے اشارۃً کنایۃً ہی کہا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایک رسول کی حکومت کا بھی یہی انداز ہوتا ہے کہ لوگ ظلم کو ظلم نہ کہہ سکیں؟

(۴) اگلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا حضرت داؤدؑ (معاذ اللہ) شدتِ جذبات سے اس قدر مغلوب ہو گئے تھے کہ ایک ایسی بات جسے دوسرے لوگ اتنی آسانی سے سمجھ گئے تھے، ان کی سمجھ میں نہ آسکی؟ انہیں اس کا احساس ان لوگوں کے اشاروں اور کنایوں ہی سے ہو سکا! کیا خدا کے رسولوں کے فہم و فراست اور احساسِ جرم کی یہی کیفیت ہوتی تھی؟ اس سے تو ظاہر ہوتا ہے کہ اگر یہ لوگ انہیں اس سے باز رکھنے کی اس طرح کوشش نہ کرتے تو انہیں اس کا احساس تک بھی نہ ہوتا کہ وہ کوئی جرم کر رہے ہیں!

(۵) فرماتے ہیں کہ دو "نیک" آدمی حضرت داؤدؑ کے پاس پہنچ گئے۔ یعنی جو دو آدمی حضرت داؤدؑ کو متنبہ کرنے کے لئے گئے وہ "نیک" تھے۔ حضرت داؤدؑ کو ان کی اس (معاذ اللہ) دراز دستی سے روکنے والوں کا شمار تو نیکوں میں ہو گیا۔ کیا مودودی صاحب فرمائیں گے کہ پھر حضرت داؤدؑ کا شمار کن لوگوں میں ہوا۔

(۶) مثال میں حضرت داؤدؑ کی ننانوے بیبیاں بتائی گئی ہیں جس سے (مودودی صاحب کی تفسیر کی رُو سے) بیویاں مراد لیا جائے گا۔ کیا حضرت داؤدؑ کی ننانوے بیویاں تھیں؟ اور اس پر بھی وہ مطمئن اور قانع نہیں تھے جو اپنی رعایا کے ایک شخص کی بیوی کو اس طرح حاصل کرنا چاہتے تھے۔ (توبہ۔ توبہ۔ استغفر اللہ)

یہ ہے وہ تفسیر جو ہمارے دور کے یہ مفسرِ اعظم پیش فرما رہے ہیں اور جسے ہمارے ہاں کے بڑے بڑے دانشورانِ قومِ اسلام کی

عظیم خدمت قرار دے کر اس تفسیر کو ساری دنیا میں عام کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں! کیا ان میں سے کسی نے سوچا ہے کہ اگر یہ تفسیر غیر مسلموں کے سامنے چلی گئی تو وہ خدا، اس کی کتاب، اور اس کتاب کے لانے والے رسولؐ کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے۔ باقی رہے مودودی صاحب، سو ان کے ناوک تنقید و تنقیص سے کون بچا ہے۔ وہ تو (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) حضور نبی اکرمؐ کے مقدس دامن کو بھی داغدار کرنے سے نہیں چوکتے۔

ضمناً مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ دو آدمی حضرت داؤد کے پاس پہنچ گئے لیکن متعلقہ آیت میں تمام صیغے جمع کے ہیں جس سے واضح ہے کہ وہ دو نہیں بلکہ زیادہ آدمی تھے۔ ان میں فریقین مقدمہ دو تھے۔

قوی اسناد صحت احادیث کا معیار نہیں

مندرجہ صدر واقعہ میں تو مودودی صاحب حضرت داؤد کی بڑی تعداد میں بیویاں تسلیم کر لیتے ہیں۔ لیکن ایک ایسا ہی واقعہ جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی بابت بیان ہوا ہے اسے یہ مضحکہ خیز قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ ﴿وَ اَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ﴾ (۳۸:۳۴)۔ (اور ہم نے اس کی کرسی پر ایک جسد لا کر ڈال دیا۔ پھر اس نے رجوع کر لیا) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> تیسرا گروہ کہتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ایک روز قسم کھائی کہ آج رات میں اپنی ستر بیویوں کے پاس جاؤں گا اور ہر ایک سے ایک مجاہد فی سبیل اللہ پیدا کروں گا، مگر یہ بات کہتے ہوئے انہوں نے انشاء اللہ نہ کہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ایک بیوی حاملہ ہوئیں اور ان سے بھی ایک ادھورا بچہ پیدا ہوا جسے دائی نے لا کر حضرت سلیمانؑ کی کرسی پر ڈال دیا۔ یہ حدیث حضرت ابوہریرہؓ نے نبی صلعم سے روایت کی ہے اور اسے بخاری و مسلم اور دوسرے محدثین نے متعدد طریقوں سے نقل کیا ہے۔ خود بخاری میں مختلف مقامات پر یہ روایت جن طریقوں سے نقل کی گئی ہے ان میں سے کسی میں بیویوں کی تعداد ۶۰ بیان کی گئی ہے، کسی میں ۷۰، کسی میں ۹۰، کسی میں ۹۹ اور کسی میں ۱۰۰۔ جہاں تک اسناد کا تعلق ہے ان میں سے اکثر روایات کی سند قوی ہے اور باعتبار روایت اس کی صحت میں کلام نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن حدیث کا مضمون صریح عقل کے خلاف ہے اور پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ بات نبی صلعم نے اس طرح ہرگز نہ فرمائی ہو گی جس طرح وہ نقل ہوئی ہے۔ بلکہ آپ نے غالباً یہود کی یاوہ گوئیوں کا ذکر کرتے ہوئے کسی موقع پر اسے بطور مثال بیان فرمایا ہو گا اور سامع کو یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی کہ اس بات کو حضورؐ خود بطور واقعہ بیان فرما رہے ہیں۔ ایسی روایات کو محض صحت سند کے زور پر لوگوں کے حلق سے اتروانے کی کوشش کرنا دین کو مضحکہ بنانا ہے۔ (صفحہ ۳۳۷)

جزاک اللہ — لیکن جب کوئی دوسرا یہی بات کہہ دے تو آپ اسے منکر حدیث اور منکر شان رسالت کے فتووں سے چھلنی کیوں کرنے لگ جاتے ہیں؟

نظام ربوبیت پر بودا اعتراض

سورۃ حم السجدہ کی دسویں آیت سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (تمام مانگنے والے اس میں برابر کے حقدار ہیں) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے پرویز صاحب کے پیش کردہ نظام ربوبیت پر چوٹ کرتے ہیں اور کوئی علمی اعتراض کرنے کی بجائے ایک بودی تشریح کے ذریعے اس نظام کی یوں تحقیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں جن لوگوں نے مارکسی تصورِ اشتراکیت کا اسلامی ایڈیشن "قرآنی نظامِ ربوبیت" کے نام سے نکالا ہے وہ سواءً للسائلین کا ترجمہ "سب مانگنے والوں کے لئے برابر" کرتے ہیں۔ اور اس پر استدلال کی عمارت یوں اٹھاتے ہیں کہ اللہ نے زمین میں سب لوگوں کے لئے برابر خوراک رکھی ہے۔ لہٰذا آیت کے منشا کو پورا کرنے کے لئے ریاست کا ایک ایسا نظام درکار ہے جو سب کو غذا کا مساوی راشن دے۔ کیونکہ انفرادی ملکیت کے نظام میں وہ مساوات قائم نہیں ہو سکتی جس کا یہ "قرآنی قانون" تقاضا کر رہا ہے۔ لیکن یہ حضرات قرآن سے اپنے نظریات کی خدمت لینے کے جوش میں یہ بات بھول جاتے ہیں کہ سائلین جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے صرف انسان ہی نہیں بلکہ مختلف اقسام کی وہ سب مخلوقات ہیں جنہیں زندہ رہنے کے لئے غذا کی ضرورت ہے۔ کیا واقعی ان سب کے درمیان یا ایک ایک قسم کی مخلوقات کے تمام افراد کے درمیان خدا نے سامانِ پرورش میں مساوات رکھی ہے ..... پھر وہ یہ بات بھی بھول جاتے ہیں کہ سائلین میں وہ حیوانات بھی شامل ہیں جنہیں انسان پالتا ہے اور جن کی خوراک کا انتظام انسان ہی کے ذمہ ہے۔ مثلاً بھیڑ، بکری، گائے، بھینس، گھوڑے، خچر اور اونٹ وغیرہ۔ اگر قرآنی قانون یہی ہے کہ سب سائلین کو برابر خوراک دی جائے۔ اور اسی قانون کو نافذ کرنے کے لئے نظامِ ربوبیت چلانے والی ایک ریاست مطلوب ہے تو کیا وہ ریاست انسان اور حیوانات کے درمیان معاشی مساوات قائم کرے گی؟　　(صفحہ ۴۴۳، ۴۴۴)

مودودی صاحب کی اس رکیک تفسیر اور بودے استدلال کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ یہ صاحب جوشِ حسد و انتقام میں اپنے مخالفین کے خلاف جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہے ہیں۔ نظامِ ربوبیت کے داعیوں نے "سواء للسائلین" سے کبھی یہ مفہوم نہیں لیا کہ دنیا میں ہر شخص کو (مثلاً) دو دو روٹیاں دے دی جائیں حتیٰ کہ صحن میں بندھی ہوئی گائے کو بھی دو روٹیاں کھلا دی جائیں اور ہاتھی کو بھی۔ سائل کے بنیادی معنی ضرورت مند کے ہیں۔ باقی رہا سواء۔ سو اس کے معنی برابر ہی نہیں۔ اس کے معنی افراط و تفریط سے محفوظ، ٹھیک ٹھیک تناسب و توازن کے ساتھ اعتدال پر قائم یا تقاضائے حکمت کے مطابق بھی ہیں (امام راغب نے یہ سب معانی دیئے ہیں)۔ آیۂ زیرِ نظر میں سواء للسائلین کے معنی یہ ہیں کہ زمین کی پیداوار کا انتظام اس طریق سے ہونا چاہیئے کہ اس سے تمام ضرورت مندوں کو ان کی ضرورت کے مطابق سامانِ پرورش مل جائے۔ پرویز صاحب نے مفہوم القرآن میں (اس آیہ کے تحت لکھا ہے "زمین کی یہ پیداوار ہر ضرورت مند کے لئے، اس کی ضرورت کے مطابق، یکساں طور پر کھلی رہنی چاہیئے۔ کسی پر اس کے دروازے بند نہیں ہونے چاہئیں" (ص ۱۱۱۱) لیکن ظاہر ہے کہ یہ معانی اس شخص کے نزدیک کس طرح قابلِ قبول یا برداشت ہو سکتے ہیں جو زمین پر "بے حد و نہایت ذاتی ملکیت" کا قائل ہو' اگرچہ زمانے کے تھپیڑوں نے اب مودودی صاحب کو بھی ملکیتِ زمین کی حد بندی تسلیم کر لینے پر مجبور کر دیا ہے۔

اسلام میں شوریٰ کا مقام

سورۃ الشوریٰ کی مشہور آیت وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

"نہ یہ کہ جو شورہ اہلِ شوریٰ کے اجماع (اتفاقِ رائے) سے دیا جائے یا جسے اُن کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو اسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا

مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے" بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں" اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لے لینے سے نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو اسی کے مطابق معاملات چلیں۔ (صفحہ ۵۱۰)

لیکن یہ دانت تو صرف دکھانے کے لئے ہیں۔ کھانے کے دوسرے ہیں جس پر کم و بیش جماعت کے شورائی نظام پر عمل ہوتا رہا انہی کی زبانی سنیئے۔

جب امیر کو چن لیا جائے گا تو اس کو سیاہ و سفید کے اختیارات ہوں گے۔ امیر کو شورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا عموماً مجلس کے فیصلے کثرت رائے سے ہوں گے مگر اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلے میں برحق ہو اور ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی تائید میں ایک جم غفیر نہیں ہے۔ لہٰذا امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ اور امیر کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کر کے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔ (اسلام کا سیاسی نظریہ۔ صفحہ ۴۹-۵۰)

حتیٰ کہ انہوں نے شروع میں جو مسودہ آئین مرتب کیا تھا اس کی دفعہ ۳۷ میں یہ کہا گیا تھا کہ

امیر (یعنی صدر) کو مجلس شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا حق حاصل ہوگا۔

(دو دستوری خاکے ص۲۸)

اب اگر آپ یہ کہیں کہ پھر مودودی صاحب نے اپنی تفسیر میں یہ کیوں کہا ہے کہ امیر مجلس کی کثرت رائے کا پابند ہوگا تو اس کا جواب خود مودودی صاحب سے سنیئے۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں کہ یہ صاحب جس جرأت اور دیدہ دلیری سے دین کے ساتھ کھیل کھیل رہے ہیں؛ اس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملے گی۔

اللہ کی آیات میں الحاد

اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا۔ (حٰم السجدہ۔ ۴۰)۔ جو لوگ ہماری آیات کو الٹے معنی پہناتے ہیں ۔۔۔ کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں:

اللہ کی آیات میں الحاد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی سیدھی بات میں سے ٹیڑھ نکالنے کی کوشش کرے۔ آیات الٰہی کا ایک صحیح اور صاف مطلب تو نہ لے باقی ہر طرح کے غلط معنی اُن کو پہنا کر خود بھی گمراہ ہو اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا رہے۔ (ص ۴۶۲)

مودودی صاحب کی ساری سیاسی زندگی اسی الحاد کی عملی تفسیر ہے۔ وہ آج ایک بات کے حق میں فیصلہ دیتے ہیں اور اسے عین مطابق قرآن و سنت قرار دیتے ہیں۔ دوسرے وقت اس کے بالکل برعکس کہتے ہیں اور اسے بھی مطابق قرآن و سنت ٹھہراتے ہیں۔ (اس کی ایک مثال تو آپ نے ابھی ابھی اوپر دیکھی ہے۔ امیر کا اپنی مجلس شوریٰ (پارلیمان یا کابینہ) کی کثرت رائے کا پابند ہونا بھی مطابق قرآن و سنت' اور اسے ویٹو کا حق حاصل ہونا بھی مطابق قرآن و سنت)۔ ۱۹۵۷ء کا ذکر ہے کہ ان کی جماعت کے چند اہم حضرات نے ان کی اس روشِ پیہم سے تنگ آ کر جماعت سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور مودودی صاحب پر اس قسم کے الحاد کا الزام عاید کیا تو انہوں نے ان کے جواب میں فرمایا کہ یہ الحاد نہیں بلکہ

کچھ اور ہے۔ وہ کچھ اور" کیا ہے' اسے خود انہی کی زبان سے سنیئے۔ انہوں نے لکھا تھا۔

آئیڈیلیزم کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے نصب العین کی انتہائی منزل سے کم کسی چیز کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ اور جن اصولوں کو وہ پیش کرتا ہے' ان پر سختی سے جما رہے۔ مگر واقعات کی دنیا میں یہ بات جوں کی توں کبھی نہیں چل سکتی۔ یہاں نصب العین تک پہنچنے کا انحصار ایک طرف ان ذرائع پر ہے جو کام کرنے والے کو بہم پہنچیں۔ دوسری طرف ان مواقع پر ہے جو اسے کام کرنے کے لئے حاصل ہوں اور تیسری طرف موافق و ناموافق حالات کے اس گھٹنے' بڑھتے تناسب پر ہے جس سے مختلف مراحل میں اسے سابقہ پیش آئے۔ یہ تینوں چیزیں مشکل ہی سے کسی کو بالکل سازگار ملتی ہیں۔ کم از کم اہل حق کو تو یہ کبھی سازگار نہیں ملی ہیں اور نہ آج ملنے کے کوئی آثار ہیں۔ اس صورت میں جو شخص یہ چاہے کہ پہلا قدم آخری منزل پر ہی رکھوں گا اور پھر دوران سعی میں کسی مصلحت و ضرورت کی خاطر اپنے اصولوں میں کسی استثناء اور لچک کی گنجائش بھی نہیں رکھوں گا وہ عملاً اس مقصد کے لئے کام نہیں کرسکتا۔ یہاں آئیڈیلزم کے ساتھ برابر کے تناسب سے حکمتِ عملی کا ملنا ضروری ہے۔ وہی یہ طے کرتی ہے کہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے راستے کی کن چیزوں کو راستے کی پیشقدمی کا ذریعہ بنانا چاہیئے۔ کن کن مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ کن کن مواقع کے ہٹانے کو مقصد کی اہمیت دینی چاہیئے اور اپنے اصولوں میں سے کن میں سے لچک ہونا اور کن میں اہم تر مصالح کی خاطر حسب ضرورت لچک کی گنجائش نکالنا چاہیئے۔

(ترجمان القرآن۔ بابت دسمبر ۵۶ء ۱۹ء

بحوالہ ہفت روزہ المنبر۔ لائلپور۔ بابت ۸ اربیع الثانی ۱۳۸۴ھ)

(۰)

حرفِ آخر یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس جلد کا تبصرہ" دانائی کی باتوں" سے شروع ہوا' اور الحاد کی تشریح پر ختم۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ ان حضرات کے ہاں دانائی کو اپنے پلڑے میں ڈال لیا جاتا ہے اور الحاد کو دوسروں کے سر تھوپ دیا جاتا۔ اور اگر اپنا الحاد روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے تو اسے حکمتِ عملی کا نام دے دیا جاتا ہے۔ فریب دہی یا فریب خوردگی کی بات اور ہے ورنہ محض اصطلاح کے بدل دینے سے تو الحاد' الہام نہیں ہو جاتا۔

اگلی نشست میں ہم تفہیم القرآن کی پانچویں جلد کے تبصرہ کے ساتھ حاضر ہوں گے۔

(پ)

پرویز صاحب کی معرکہ آرا انگریزی کتاب

ISLAM: A CHALLENGE TO RELIGION

جس نے اپنے ملک کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے ارباب فکر و نظر سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا ہے

قیمت :۔ (بکس بورڈ کور) -/۲۰ روپے

قیمت :۔ (خوبصورت جلد کے ساتھ) -/۳۰ روپے

محصولڈاک اور پیکنگ علاوہ

جلد حاصل کیجئے۔

ناظم

نایاب کتابوں کے نئے ایڈیشن

مفکرِ قرآن پرویز صاحب کی جن بلند پایہ کتابوں کے سابقہ ایڈیشن ختم ہو گئے تھے ادارہ طلوعِ اسلام نے شائقین کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کے پیشِ نظر ان کے تازہ ایڈیشن شائع کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے حالانکہ موجودہ ہوشربا گرانی اس کی ہمت نہیں دلاتی تھی۔ ان میں سے **ابلیس و آدم** اور **جوئے نور** کے تازہ ایڈیشن پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ اب،

اسی سلسلہ کی تیسری مایۂ ناز تصنیف ـــــــ،

برقِ طُور

کا نیا ایڈیشن بھی چھپ گیا ہے!

یہ مشتمل ہے آدیزش صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسےٰؑ اور فرعون، اور بنی اسرائیل کی داستانِ عروج و زوال پر۔ اس میں ان کے واقعات ہی درج نہیں بلکہ اس ضمن میں نہایت اہم موضوع بھی سامنے آ گئے ہیں۔ مثلاً عصائے موسیٰ۔ یدِ بیضا۔ ساحرینِ دربارِ فرعون کی کرشمہ سازیاں اور ان کی حقیقت۔ سمندر کا پھٹنا اور چشموں کا پھوٹنا۔ من و سلویٰ عطا ہونا۔ حضرت موسیٰ کا ایک مردِ بزرگ سے ملنا۔ ان تمام مباحث پر بڑی تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اور داستانِ بنی اسرائیل کے سلسلہ میں قوموں کے عروج و زوال کے ابدی قوانین بھی سامنے آ گئے ہیں۔ مصنف کی نظرِ ثانی نے مضامین میں خاصا تنوع پیدا کر دیا ہے۔ کتاب بڑے سائز کے عمدہ سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔

جلد مضبوط اور حسین گرد پوش سے مزین۔　　قیمت (فی جلد۔ علاوہ محصول ڈاک اور پیکنگ) پندرہ روپے

قرآنی فیصلے (جلد اوّل)

کا پہلا ایڈیشن بھی ختم ہو چکا تھا۔ اب اس کا تازہ ایڈیشن شائع کر دیا گیا ہے۔ یہ حصہ نماز، روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ کے علاوہ عام معاشرتی مسائل اور حرام و حلال کے سے اہم موضوعات پر مشتمل ہے۔

قیمت۔ (بکس بورڈ کی جلد کے ساتھ) -/۵ روپے (علاوہ محصول ڈاک و پیکنگ)

ناظم - ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ۔ لاہور

طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ نومبر ۱۹۷۲ء

تعلیمی جدید پالیسی

محترم چوہدری عطاء اللہ صاحب۔ ایڈووکیٹ۔ ساہیوال

سلطنتِ مغلیہ کے زوال اور خاتمہ کے ساتھ برِعظیم میں انگریز کے غلبہ اور تسلط کی ساعتِ نامسعود سے لے کر آج کے دن کے لمحاتِ اضطراب تک قومی تعلیم کا مسئلہ ہمارا اہم ترین مسئلہ رہا ہے۔ ہمارے مقدر کے بگڑنے اور سنورنے میں ہمارے تعلیمی نظریات و رجحانات نے مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ حکومت کھو دینے کے بعد ہندی مسلمان نے تعلیم اور بالخصوص علومِ جدید کی تعلیم سے بے رُخی برتی تو ہمسایہ ہندو قوم نے اُس کی اِس نادانی سے خوب جی بھر کر فائدہ اٹھایا۔ حکومت نے ترویجِ تعلیم کے لئے ملک میں سکول اور کالج کھولے تو مسلمانوں نے اُن کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ جبکہ ہندو نوجوان اُن کی طرف بے تابانہ لپکے اور زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو کر ملک میں انگریز کے قائم کردہ جدید عدالتی نظام اور سرکاری دفاتر پر چھا گئے۔ مسلمان اپنی تعلیمی پسماندگی کے سبب ملکی تجارت، صنعت، باوقار پیشوں اور سرکاری ملازمتوں سے بتدریج خارج ہوتے چلے گئے۔ ہندو کو مسلمان پر اس طرح برتری اور بالادستی حاصل ہوئی اور وہ ملکی نظام میں انگریز کا شریکِ کار بنا تو اس بے مروت قوم نے نئے آقا کی شہ پا کر اپنے پرانے آقا اور ولیِ نعمت کو زندگی کے ہر شعبے میں بے دریغ ہدفِ استحصال بنایا۔

مسلمان، کہ بقول سر ولیم ہنٹر، برِعظیم میں انگریز کی آمد کے وقت تعلیم و تمدن میں ہند کی باقی سب قوموں سے آگے تھے۔ جدید تعلیم کے بارے میں غیر حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کرنے سے تباہی کے عمیق غار کے دہانے تک جا پہنچے۔ جہاں ایک بھیانک اور تاریک مستقبل ان کو اپنی گود میں لے کر فنا کی نیند سُلا دینے کا منتظر تھا۔ عروس البلاد دہلی، کہ مسجودِ دلِ عمدیدۂ اقبال ہے، ایسے میں اُس کے افق پر چھاتی ہوئی تاریکیوں کا دامن چاک ہوا اور چاکِ داماں سے امید کی ایک شوخ کرن پھوٹی جس نے آسمانِ علیگڑھ کا رُخ کیا۔ علیگڑھ کہ پاک و بھارت کی ملتِ اسلامیہ کے عروج و زوال کی داستان میں اس کا ذکر ہوش مند دیوانوں کی بستی کے باب میں آتا ہے۔ دہلی کے افق سے پھوٹنے والی کرن اس کے آسمان تک پہنچی تو گویا اس نے اپنی منزل کو پالیا۔ کرن نے روشنی کے ایک بلند مینار کی صورت اختیار کر لی۔ روشنی کے اس بلند مینار نے سرسید اعظم کا لقب پایا۔ سرسید کہ جس کے سوزِ نفس سے جسدِ ملت میں پھر سے خونِ زندگی دوڑا اور ہندی مسلمان میں زندہ رہنے اور اس سرزمین پر ایک باوقار قوم بن کر زندہ رہنے کا عزم و حوصلہ پیدا ہوا۔ کاروانِ ملت پھر سے سرگرمِ سفر ہوا اور واماندہ راہی نے تیز خرامی کے وہ جوہر دکھائے کہ تماشائی ورطۂ حیرت میں ڈوب گئے۔

انگریز کی پروردہ اور انگریز کے زیرِ سایہ پھولنے پھلنے کی تمنائی انڈین نیشنل کانگرس کو بدیسی حکمرانوں سے پنجہ آزمائی کی جرأت مسلمان نے دلائی۔ تحریکِ خلافت چلا کر یورپ کے مردِ بیمار کو آغوشِ لحد میں جانے سے ہندی مسلمان نے بچایا۔ اور آخر میں تو اس نے وہ کارِ نمایاں کر دکھایا جس پر کارکنانِ قضا و قدر نے بھی صلوٰۃ و رحمت کے پھول برسائے ہوں گے۔ اساس اور نصب العین کے اعتبار سے پاکستان کی تصوراتی ریاست کی نظیر تاریخِ عالم میں کہیں ملتی ہے تو مدینہ کی اس ننھی سی ریاست میں ملتی ہے جس کی ابتدا آج سے چودہ سو برس قبل محسنِ انسانیت کے دستِ مبارک سے ہوئی۔ کتنی بڑی بھی یہ سعادت جو ہمیں نصیب ہوئی۔ لیکن ہم ہیں کہ اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر نہ کر پائے۔ اس تصوراتی ریاست کے قیام پر ربع صدی بھی نہ گذرنے پائی تھی کہ ہماری شامتِ اعمال نے دنیا کی اس منفرد اور عجوبۂ روزگار تخلیق کو نیم بسمل بنا دیا۔ ہماری مجرمانہ غفلت نے پاکستان کو دولخت کر دیا۔ ملک کا آدھا حصہ نظریۂ پاکستان سے منحرف ہو کر اغیار کی جھولی میں جا گرا۔ اور جو بچ رہا اُسے بھی باہم متضاد اور متخالف نظریات کی رزمگاہ بنا لیا گیا ہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت برِعظیم کے مسلمانوں میں جو اتحادِ فکر و نظر پیدا ہوا تھا مدتوں سے ہوا ہو چکا ہے۔ اسلام کے مقدس نام پر حاصل کئے گئے وطن میں ہر کوئی اپنے اقتدار کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ کھڑی کرنے کے درپے ہے۔

ماضی میں ہم نے جس طور پر نژادِ نو کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا، ہماری قوم کا مقدر بھی اُسی انداز سے بنتا اور بگڑتا رہا۔ یہ کلیہ آج بھی اُسی طرح صحیح اور درست ہے۔ اپنی تعلیمی پالیسی کو نظریاتِ اسلام کے تابع رکھ کر ہی ہم پاکستان کو بانیٔ پاکستان کی آرزو کے مطابق فکرِ قرآنی کی حامل و پابند فلاحی مملکت بنا سکتے ہیں۔ یقیناً ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ ماضی میں ہماری تعلیمی پالیسی کے خدوخال کیا تھے اور وہ پالیسی کیونکر حصولِ پاکستان میں ممد و معاون ہوئی۔ اور پھر پاکستان بن جانے کے بعد نژادِ نو کی تعلیم و تربیت کے بارے میں ہم سے کیا غفلت ہوئی کہ ہماری یہ نئی نسل پاکستان کو دسمبر ۱۹۷۱ء کے المیے سے نہ بچا سکی؟

ہندوستان میں انگریز کے پاؤں خوب سے جم گئے تو اس نے ہندوستانیوں کے لئے جو نظامِ تعلیم وضع کیا اس کی غایت مقامی آبادی میں سے ایسے افراد کی مناسبِ حال تربیت مقصود تھی جو اعلیٰ انگریز حکام کی ماتحتی میں انگریز کے منشاء کے مطابق حکومت کے دفتری نظام کو چلائیں اور غیر ملکی حکومت کی سکیموں اور پالیسیوں کو کامیاب بنانے میں حکومت اور رعایا کے درمیان واسطہ کا کام دیں۔ اِس نوع کی تعلیم پانے والوں میں حکام پرستی کے جراثیم کی پرورش تعلیم کا اہم جزو تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ انگلستان اور یورپ میں سائنسی ایجادات نے صدیوں سے متوارث چلے آ رہے سیاسی اور مذہبی ڈھانچوں کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہندوستان میں انگریزی تعلیم پائے ہوئے نوجوانوں میں مذہبی رسوم و روایات سے انحراف کے رجحانات کا ہندو نے تو کچھ خاص اثر نہ لیا کہ ہندو کو اپنے مذہب کے بارے میں اُس وقت تک کچھ تشویش نہیں ہوتی جب تک کہ اس کے ذات پات کے سسٹم پر زد نہ پڑے اور اُس کی چھوت چھات سے تعرض نہ کیا جائے۔ ہندو عقیدہ کی رو سے اگر خدا کو ماننے والا اور خدا کو نہ ماننے والا دونوں ہندو مذہب کے پیرو کہلا سکتے ہیں تو انگریزی خواندہ ہندو نوجوانوں کا بعض قدیم عقائد سے منحرف ہو جانا ہندو جاتی کے لئے کیونکر باعثِ پریشانی ہو سکتا تھا؟ انگریز بھی ہندو کی ذات پات اور

چھوت چھات کی روشنی پر معترض نہ تھا کہ وہ خود بھی پالیسی کے طور پر مقامی باشندوں سے خلا ملا رکھنے کے حق میں نہ تھا۔ ہندوستانیوں سے انگریز صرف غیر مشروط وفاداری کا خواہاں تھا جس کا ہندو نے اُسے یقین دلا رکھا تھا۔ ہندو اور انگریز میں ایک طرح کی مفاہمت ہو چکی تھی اور دونوں اپنی اپنی جگہ مطمئن تھے۔ لیکن انگریز اور مسلمان کے مابین صورتِ حالات اس سے مختلف تھی۔ انگریز کی آمد سے قبل مسلمان یہاں کے حاکم اور فرمانروا تھے اور حکومت کھو چکنے کے بعد بھی صحیح یا غلط اِس زعم میں مبتلا تھے کہ ان کی اپنی تہذیب (جو حقیقت میں خالص اسلامی تہذیب بھی نہ تھی) تہذیب فرنگ سے اعلیٰ وارفع ہے۔ انگریز بھی خوب جانتا تھا کہ ہندوستان میں اُس کا حریف ہندو نہیں مسلمان ہے۔ انگریز مسلمان کا مذہب بگاڑنے کے لئے اور انگریزی تہذیب و تمدن کی برتری جتانے کے لئے تو مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا خواہاں ہو سکتا تھا۔ لیکن تعلیم پا کر ہندو کے دوش بدوش کاروبارِ سلطنت میں مسلمان کی شرکت انگریز کو پسند نہ تھی۔ انگریز اپنے دل میں خوش تھا کہ مسلمان تعلیم سے کنارہ کش ہے۔

جدید ادب اور سائنس میں منافی مذہب نظریات کا پایا جانا تعلیم سے مسلمان کے علیحدہ رہنے کی معقول وجہ تھی۔ خود سرسیدؒ کو بھی تسلیم تھا کہ انگریزی تعلیم نے مذہبی عقاید پر کاری ضرب لگائی ہے۔ چنانچہ اپنی ایک تقریر میں سرسیدؒ نے اپنی اِس رائے کا اظہار یوں فرمایا:-

> میں ایک شخص ہوں جس کا یقین ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو جدید فلسفہ اور جدید علم طبیعی سے بخوبی واقف ہو اور اُن تمام اسلامی مسائل پر جو اِس زمانے میں اسلامی مسائل کہلاتے ہیں یقین رکھتا ہو۔ انگریزی خواں نوجوان مجھے معاف کریں گے میں نے کوئی انگریزی خواں جس کو انگریزی علوم کا مذاق بھی حاصل ہو گیا ہو ایسا نہیں دیکھا جس کو پورا پورا یقین ہمارے زمانہ کے مروجہ اِسلام پر ہو۔ میں یقین کرتا ہوں کہ جس قدر یہ علوم پھیلیں گے اور ان کا پھیلنا ضروری ہے اور میں خود بھی ان کے پھیلانے میں معین و مددگار ہوں۔ اُسی قدر لوگوں کے دلوں میں مروجہ اسلام کی جانب سے بدظنی و بے پروائی بلکہ روگردانی ہوتی جائے گی۔ میرا یہ بھی یقین ہے کہ اصلی مذہب کا یہ نقصان نہیں ہے بلکہ یہ ان غلطیوں کے سبب ہے جو اسلام کے نورانی چہرے پر لگ گئی ہیں یا لگا دی گئی ہیں۔

سرسیدؒ کی تقریر کے مندرجہ بالا اقتباس سے دو باتیں نکھر کر ہمارے سامنے آگئیں۔ ایک یہ کہ علومِ جدیدہ کے انکشافات اور مروجہ مذہب کے معتقدات کے درمیان ایک واضح تضاد موجود ہے۔ دوسری یہ کہ اصلِ دینِ اسلام کو سائنس وغیرہ کے جدید نظریات سے گزند پہنچنے کا احتمال نہیں۔ یہاں پر یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ سرسیدؒ نے جسے اصلی مذہب کہا ہے یہ وہی دینِ اسلام ہے جو چودہ سو برس سے قرآن کے الفاظ و اوراق میں موجود اور محفوظ چلا آ رہا ہے۔ اِس کی تائید سرسیدؒ کے متعدد اقوال و تحریرات سے ہوتی ہے جن کا بیان یہاں غیر ضروری ہوگا۔

سوال ہوگا کہ انگریزی تعلیم کے متعلق یہ رائے رکھتے ہوئے سرسیدؒ نے اِس شد و مد سے اس کی تائید اور حمایت کیوں کی؟ جواب سرسیدؒ کی تقریر کے مندرجہ بالا اقتباس میں ہی موجود ہے۔ جہاں کہا گیا ہے کہ علومِ جدیدہ کی زد اصلِ اِسلام پر نہیں پڑتی۔ طبیعی احوال قانونِ فطرت کے تابع اور اس لحاظ سے خدا کا اپنا فعل ہیں۔ جبکہ قرآن کے اوراق میں محفوظ دینِ اسلام خدا کا اپنا قول ہے۔ ان دونوں میں تضاد امرِ محال ہے۔ تاہم ان میں اگر کہیں تضاد

دکھائی دے تو ہمارا فرض ہے کہ ان میں تطبیق پیدا کر دکھائیں اور اگر ایسا ہوتا دکھائی نہ دے تو پھر دلیل و برہان سے ثابت کر دکھائیں کہ قرآن کا قول حق ہے اور سائنس کا بیان کردہ نظریہ باطل۔ سرسید کی تعلیمی پالیسی یہی تھی کہ علومِ جدید کے مضر اثرات سے بچنے کے لئے علمی نظریات اور دینی عقاید میں مطابقت پیدا کی جائے ورنہ تعلیم پانے والی نئی نسل اسلام سے برگشتہ ہو جائے گی۔ تاہم اس نوع کی تعلیم کا اہتمام سرکاری مدارس میں ممکن نہ تھا۔ اس کے لئے مسلمانوں کو جدید طرز کی اپنی درس گاہیں قائم کرنے کی ضرورت تھی۔ علیگڈھ میں ایم۔ اے۔ او کالج کا قیام سرسید کی اسی تعلیمی پالیسی کا مرہونِ منت تھا۔ بقول مولانا محمد علی جوہر عظیم میں سب سے پہلے مسلمانوں ہی نے سرسید کی زیرِ رہبری قومی تعلیم میں حکومت کے دخل و اختیار کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا اور مسئلہ تعلیم میں حکومت سے عدمِ تعاون کی راہ اختیار کی۔ مولانا محمد علی جوہر کہ سرسید کی عظیم درس گاہ کے عظیم ترین فرزند تھے اپنی مادرِ علمی کے اندازِ تربیت کو بدیں الفاظ خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:-

> علیگڑھ نے بہت سی باتوں میں مشرق و مغرب کا ایک حسین امتزاج پیدا کر لیا تھا اور اس نے مغربی سائنس اور ادب میں نمایاں ترقی کے علی الرغم اپنے قومی غرور کا پرچم کبھی سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ یہی چیز اس کے طلباء میں صحیح راہِ عمل اختیار کرنے کا ایک قوی جذبہ محرکہ رہی ہے۔

سرسید کی تعلیمی پالیسی ان کی ایک تقریر کے اس ٹکڑے میں سمٹ آئی ہے جس میں انہوں نے مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کی طرف مخاطب ہو کر کہا تھا:

> یاد رکھو! سب سے سچا کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے۔ اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے۔ پھر اگر تم آسمان کے تارے ہو گئے تو کیا؟ پس امید ہے کہ اگر تم ان دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام) کے نمونے ہو گے جبھی ہماری قوم کو عزت ہو گی۔

یہی تعلیمی پالیسی جو حصولِ پاکستان میں ہماری ممد و معاون ہوئی۔ شجرِ پاکستان کا بیج ایم۔ اے۔ او کالج کی صورت میں علیگڈھ ہی میں بو یا گیا۔ قائدِ اعظمؒ نے سچ فرمایا تھا کہ پاکستان کی جنگ میں علیگڈھ ہمارا محفوظ اسلحہ خانہ (ARSENAL) ہے جہاں سے اس عظیم سیاسی معرکہ آرائی کے لئے ہمیں سامانِ حرب متواتر ملتا رہتا ہے۔ سرسید کی تعلیمی پالیسی نے ہمیں نہ صرف علومِ جدید کی مضرت رسانیوں سے محفوظ رکھا بلکہ مسلمان کے ملی تشخص کو زندہ و برقرار رکھنے میں اس پالیسی نے اہم کردار ادا کیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا کے ایجوکیشنل کمشنر سر جارج اینڈرسن کے بقول علیگڑھ محض ایک تعلیمی ادارہ نہ تھا بلکہ ایک اثر تھا جو تمام ملک پر بلکہ بیرونِ ملک تک چھایا ہوا تھا۔ سرسید کی تعلیمی پالیسی جب ہمیں پاکستان کی منزل تک لے آئی تو ہم نے اس سے صرفِ نظر کر لیا۔ پاکستان بن جانے کے بعد ہماری کوئی تعلیمی پالیسی نہ رہی۔ نتائج سے بے پرواہ ہم بے مقصد تعلیم کا اہتمام کرتے چلے آ رہے ہیں۔ تعلیم کا معیار پستی سے پست ہوتا چلا جا رہا ہے۔ نئے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں ہیں کہ کھلتی چلی جا رہی ہیں۔ تعلیم یافتہ بے کاروں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

ان حالات میں مرکزی حکومت کی جدید تعلیمی پالیسی اور تعلیمی اصلاحات کا اعلان ہوا تو ہم نے وزیرِ تعلیم اور

دیگر وابستگانِ حکومت کے اعلانات و بیانات میں عبث یہ تلاش کرنے کی کوشش کی کہ شاید تعلیم کے تھکا دینے والے طویل سفر کی کوئی منزل متعین ہوئی ہوگی اور کوئی جدید تعلیمی نظریہ سامنے لایا گیا ہوگا۔ معیارِ تعلیم کو بلند کرنے اور تعلیم یافتہ بے کاروں کی فوجِ ظفر موج میں کمی لانے کی کوئی تدبیر کی گئی ہوگی۔ لیکن بے دیکھے جو بات منظرِ عام پر آئی وہ یہ ہے کہ حکومت نے تمام غیر سرکاری کالجوں اور سکولوں کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے اور یوں کروڑوں روپیہ سالانہ کا مزید بوجھ خزانۂ سرکار پر پڑ گیا ہے۔

اِس وقت ہماری درس گاہوں میں تعلیم کم اور سیاست بازی (بالفاظ دیگر بے مقصد ہنگامہ آرائی) زیادہ ہوتی ہے۔ طلبا زیادہ تر غیر تعلیمی مشاغل میں مصروف رہ کر وقت گذارتے ہیں۔ وہ نہ صرف ایک جویائے علم کی طلبِ صادق سے ناآشنا ہیں بلکہ اُن کے سامنے سرے سے زندگی کا کوئی نصب العین ہی نہیں ہے جس کے لئے وہ خلوصِ دل سے جدوجہد کر سکیں۔ ہمارے یہ نونہال تخلیقِ پاکستان کے مقاصد سے سراسر بے خبر ہیں۔ اسلام سے کھلی مخاصمت کا اظہار تو نہیں کرتے، لیکن دین کے تقاضوں سے بے پرواہ ضرور ہیں۔ بسا اوقات غیر اخلاقی حرکات بھی کر گذرتے ہیں۔ یہ طلبا بالعموم دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو سوشلزم اور کمیونزم کے نظریات سے متاثر ہے اور دوسرا وہ جو محض گھریلو ماحول اور معاشرتی جواب کے تحت ایک خاص انداز کا جذباتی لگاؤ مذہب سے رکھتا ہے۔ ان دونوں گروہوں کو سیاسی جماعتوں نے اپنے مقاصد کے لئے آلۂ کار بنا رکھا ہے۔ تعلیمی اداروں میں آئے دنوں کی ہڑتالیں، مظاہرے اور توڑ پھوڑ اسی بیرونی دخل اندازی کا نتیجہ ہیں۔

تعلیم کا ہمارے ہاتھوں یہ حشر ہوا تو کالجوں اور یونیورسٹیوں سے تعلیمی اسناد پائے ہوئے وہ نوجوان جو خوش قسمتی سے بے کاری کا شکار ہونے سے بچ نکلتے ہیں اور دھن، دھونس، دھاندلی یا سفارش سے کسی کام پر لگ جاتے ہیں یا کسی ملازمت میں لے لیے جاتے ہیں اُن میں سے بیشتر اپنے فرائض کو بطریقِ حسن سرانجام دینے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ تعلیم میں معیار کی پستی نے ملک کے ایڈمنسٹریشن کا معیار بھی گرا دیا ہے۔ تعلیمی پالیسی کے ذمہ داروں کی نظر اس حقیقت کی طرف کیوں نہیں جاتی؟

یہ بات اب ایک حقیقتِ ثابتہ کے طور پر سامنے آچکی ہے کہ المیہ مشرقی پاکستان میں وہاں کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلبا کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ ہم یہ سوال اربابِ حکومت اور خداوندانِ تعلیم سے کرنا چاہتے ہیں کہ اگر مشرقی پاکستان میں نئی نسل کو نظریۂ پاکستان سے بے خبر رکھنے اور ناپختہ ذہن طلبا کو غیر اسلامی نظریات کے حامل اساتذہ کے ہاتھوں میں سونپ دینے کا نتیجہ دسمبر ۱۹۷۱ء کے حادثۂ عظیم کی صورت میں ظاہر ہو سکتا ہے تو مغربی پاکستان کے تحفظ کی ضمانت رائج الوقت سیکولر انداز کے نظامِ تعلیم کی موجودگی میں کون دے سکتا ہے؟

کاش کہ ہمارے یہاں کے مقتدیانِ تعلیم کو نوجوان نسل کے سود و زیاں اور اپنی بلند اخلاقی اقدار کے تحفظ کا احساس اس قدر تو ہوتا کہ جس کا اظہار آج سے نصف صدی قبل انگلستان کے شریف النفس بادشاہ جارج پنجم نے صاحبزادہ آفتاب احمد خان سے انگلستان میں تعلیم پائے ہندوستانی طلبا کے بارے میں اُس وقت کیا جبکہ صاحبزادہ صاحب انڈیا کونسل میں اپنی رکنیت کی میقات پوری کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالنے کے لئے واپس ہندوستان آرہے تھے۔ شاہ جارج کے الفاظ میں بات یوں کہی گئی:۔

> کثرت سے جو طلباء ہندوستان سے یہاں آتے ہیں وہ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ اپنا مذہب بھول جاتے ہیں یہاں بُرے اخلاق سیکھتے ہیں۔ اِس طرح بجائے نفع کے اُن کو نقصان ہوتا ہے۔ میں نے گورنمنٹ ہند کے افسروں سے کہا ہے کہ ان طالب علموں کو یہاں آنے سے روکو۔"

بجا طور پر پوچھا جا سکتا ہے کہ ہمارے اپنے یہاں نوجوان طلبا جن خرابیوں کا شکار رہے اُن کے روکنے کی اب تک کیا تدابیر ہوئی ہیں؟ اور یہ کہ تعلیمی اداروں کے اندر نونہالانِ ملت کی سیرت و کردار میں اسلامیت اور پاکستانیت کے فروغ و نمو کی کیا کچھ کوششیں کی جا رہی ہیں؟

حکومت کی جدید تعلیمی پالیسی سے تو صرف دو باتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک یہ کہ تمام غیر سرکاری سکول اور کالج سرکاری تحویل میں لے لئے گئے ہیں اور دوسری یہ کہ مسلمان طلباء کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ شیعہ اور سنی۔ ان دونوں کے لئے دینیات کے نام سے پڑھائے جانے والے مضمون کا نصاب الگ الگ ہوگا۔

تعلیم کے تو میلاسے جانے پر ہم معترض نہ ہوتے اگر یہ بتا دیا جاتا کہ بجز تعلیمی معاملات میں انتظامیہ قسم کے معمولی ردو بدل کے نفسِ تعلیم پر اِس "انقلاب" کا کیا اثر پڑا ہے؟ کیا رہوارِ تعلیم کا رُخ ترکستان کی بجائے سمتِ کعبہ کو موڑا جا چکا ہے؟ اسلام کے نام پر قائم ہونے والی تصوراتی ریاست میں تعلیم کے نام پر مسلمان بچوں کو سنی دینیات اور شیعہ دینیات کی صورت میں پلائے جانے والا زہر جسے خدا کی کتابِ عظیم میں شرک کا نام دیا گیا ہے اِسے تعلیمی انقلاب کا نام دے کر آخر قوم کو ہم کن مزید حوادث سے دوچار کرنا چاہتے ہیں؟ تعلیمی پالیسی کے واضعین قرآن تو پڑھتے ہی ہوں گے قرآن میں یہ آیت تلاش کریں۔ شیعہ دینیات اور سنی دینیات کی اصل و حقیقت ان پر خود بخود واضح ہو جائیگی۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا۔

تعلیمی اداروں میں دینیات کی تعلیم کے نام سے اٹھائے جانے والے فرقہ بندی کے اس فتنہ کی اصل و حقیقت برِعظیم میں تعلیم جدید کے دورِ اول کے ایک عظیم المرتبت استاد کی زبان سے بھی سنیئے جو کہ خود بھی ایک مذہبی فرقہ کے چوٹی کے علماء کے خاندان کے چشم و چراغ تھے لیکن ایک تعلیمی حادثہ نے ہی اُن کی آنکھیں کھول دیں اور شیعہ سنی کی تفریق کی فتنہ انگیزیاں اُن پر عیاں ہوگئیں۔ فرماتے ہیں۔

> مذہب کے معاملے میں میرا ایک خیال ہے۔ خدا جانے احباب کو پسند آئے یا نہ آئے۔ ذرا خیال کر کے دیکھو۔ اسلام ایک خدا ایک۔ سُنی اور شیعہ کا اختلاف ایک مسئلہ خلافت پر ہے جس کے واقعہ کو آج کچھ کم تیرہ سو سال گذر چکے ہیں۔ وہ ایک حق تھا کہ سنی بھائی کہتے ہیں جنہوں نے لیا حق لیا۔ شیعہ بھائی کہتے ہیں کہ حق اوروں کا تھا، اُن کا نہ تھا۔ اگر پوچھیں کہ انہوں نے اپنا حق کیوں نہ لیا؟ جواب یہی دیں گے کہ صبر کیا اور سکوت کیا۔ تم لینے والوں سے اِس وقت لے کر دلا سکتے ہو؟ نہیں۔ طرفین میں سے کوئی موجود ہے؟ نہیں۔ اچھا جب یہ صورت ہے تو آج تیرہ سو برس کے بعد اِس معاملے کو اس قدر طول دینا کہ قوم میں ایک فسادِ عظیم کھڑا ہو جائے۔ چار آدمی بیٹھے ہوں تو صحبت کا مزا جاتا رہے۔ کام چلتے ہوں تو بند ہو جائیں۔ دوستیاں ہوں تو دشمنیاں ہو جائیں۔ دنیا جو مزرعہ آخرت ہے اُس کا وقت کار ہائے نمایاں سے ہٹ کر جھگڑے میں جا اُلجھے۔ قوم کی اتحادی قوت ٹوٹ کر چند در چند نقصان گلے پڑ جائیں۔ یہ کیا ضرور ہے؟

بہت خوب۔ تم ہی حق پر سہی لیکن انہوں نے صبر کیا اور سکوت کیا۔ پس اگر تم اُن کے ہو تو تم بھی صبر اور سکوت ہی کرو۔ زبانی بدگوئی اور بدکلامی کرنی اور بھٹیارنیوں کی طرح لڑنا کیا عقل ہے؟ اور کیا انسانیت ہے؟ کیا تہذیب ہے؟ کیا حُسنِ اخلاق ہے؟ تیرہ سو برس کی بات ایک بھائی کے سامنے اس طرح کہہ دینا جس سے اُس کا دل آزردہ بلکہ جل کر خاک ہو جائے، اس میں کیا خوبی ہے؟ میرے دوستو! اول ایک ذرا سی بات تھی۔ خدا جانے کن کن لوگوں کے جوشِ طبع اور کن کن لوگوں کی تلواریں درمیان میں آکر لاکھوں کے خون بہ گئے۔ خیر اب وہ خون خشک ہو گئے۔ زمانہ کی گردش نے پہاڑوں خاک اور جنگلوں مٹی اُن پر ڈال دی۔ ان جھگڑوں کی ہڈیاں اکھیڑ کر تفرقہ کو تازہ کرنا اور اپنا یئیت میں فرق ڈالنا کیا ضرور ہے۔ اور دیکھو۔ اس تفرقہ کو تم زبانی بات نہ سمجھو۔ یہ وہ نازک معاملہ ہے کہ جن کے حق کے لئے تم آج جھگڑے کھڑے کرتے ہو وہ خود سکوت کر گئے۔ تقدیری بات ہے۔ اسلام کے اقبال کو ایک صدمہ پہنچنا تھا سو نصیب ہوا۔ فرقہ کا تفرقہ ہو گیا اور ایک کے دو ہو گئے۔ پورا ورق تھا آدھا آدھا ہو گیا ..... "

یہ عظیم استاد آپ ہی کے شہر لاہور کے ایک گوشے میں ابدی نیند سو رہا ہے۔ شمس العلما رشید مولوی محمد حسین آزاد کے نام اور علم و ادب کی دنیا میں اُن کے مقام سے کون ہے جو واقف نہ ہو گا!

محمد حسین آزاد تو ہمارے اپنے تھے۔ اگر اپنوں کی نہیں سننا چاہتے تو ایک بیگانے کی سنیئے۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر برنارڈ شا نے مولانا کے ایک دوست کو ہندوستان میں تعزیت نامہ بھیجا جس میں اس انگریز ادیب نے مولانا کی حمیتِ اسلامی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے اور مولانا سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا کہ میرے اور محمد علی کے درمیان موضوعِ گفتگو یہ تھا کہ اسلام کا احیا کیونکر ممکن ہے اور مسلمان اقوامِ عالم میں اپنا کھویا ہوا مقام کیونکر پھر سے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہم دونوں متفق تھے کہ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اسلام پر جو تہ بہ تہ غلاف چڑھے ہوئے ہیں انہیں ایک ایک کر کے اتار دیا جائے تا آنکہ مسلمانوں کے سامنے وہ ٹھیٹھ اسلام نکھر کر آجائے جسے بانیٔ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عربوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ ٹھیٹھ اسلام سُنّی دینیات اور شیعہ دینیات کے نصاب کا اسلام نہ تھا بلکہ وہ اسلام تھا اسلام ہے جو اب بھی لوحِ قرآن میں محفوظ ہے۔ اگر پاکستان کا قیام اسلام کی سربلندی اور مسلمان کی سرفرازی کے لئے عمل میں آیا تھا تو نئی نژاد کے سامنے وہی ٹھیٹھ اسلام پیش کیجئے جو سُنّی شیعہ کے غیر قرآنی اور غیر اسلامی تصورات سے پاک ہو۔

فرقہ آرائی کو اب سے پہلے مولوی کا کاروبار سمجھا جاتا رہا ہے۔ اور پڑھے لکھے لوگ اس کے کاروباری ہتھکنڈوں سے آگاہ ہو کر ان فضولیات سے بڑی حد تک کنارہ کش ہو چکے تھے۔ لیکن نئی تعلیمی پالیسی کے تحت یہ کاروبار حکومت خود سنبھالنے کے درپے دکھائی دیتی ہے۔ ان نئے بیوپاریوں سے ہم مخلصانہ درخواست کرتے ہیں کہ اگر گلشنِ قرآنی کی بہاروں میں نئی نژاد کی پرورش کا اہتمام آپ کے بس کی بات نہیں تو سوختہ بخت قوم کی اس متاعِ عزیز کو جلتے سیکولرزم کی قربانگاہ پر قربان کر دیجئے معلوم ہے! لیکن خدارا ان نونہالوں کو دینیات کے نام پر ایسے رنگے۔ زادوں کے سپرد نہ کیجئے جہاں کا انجام ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنا ہو گا۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو آپ کا اور قوم کا سامنا کچھ اس انداز سے ہو گا۔

آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر!

بصیرت افروز و انقلاب آفریں کتابیں

قائدِ اعظمؒ کے تصور کا پاکستان

پرویز صاحب کے قلم سے یہ کتاب حال ہی میں شائع ہوئی ہے جس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ • پاکستان کی بنیاد کیا تھی؟ • بانیٔ پاکستان اقبالؒ اور معمارِ پاکستان قائدِ اعظمؒ نے اِس مملکت کا تصور کیا دیا تھا؟ • دو قومی نظریہ کیا ہے؟ یہ نظریۂ پاکستان نہ کبھی فیل ہوا ہے نہ کبھی فیل ہو سکتا ہے • پاکستان اب بھی ایک قابلِ فخر ملک بن سکتا ہے — یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا ایک نسخہ ہر اس گھر میں ہو جس کے بچے تعلیم حاصل کر رہے ہوں یا کر چکے ہوں۔ قیمت :- دس روپے (علاوہ محصولڈاک)

قرآنی فیصلے

زندگی کے بیسیوں مسائل اور معاشرے کے معاملات کے متعلق قرآن کے احکام کیا ہیں؟ اور ہم کیا کرتے ہیں؟ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقات، خیرات، قربانی، ترکہ، وصیت۔ نکاح، طلاق، اوقاف، شراب، جوا، حرام و حلال یا مثلاً شبِ برات۔ عید میلاد۔ تصویر کشی، موسیقی، سینما، مشاعرے۔ عذابِ قبر، نبی اکرمؐ و علم غیب۔ حضورؐ کا معراج۔ الہام۔ مرکزِ ملت۔ غلام اور لونڈیاں وغیرہ جن کے متعلق قرآن کے فیصلے کا آپ کو علم نہیں ان کے بارے میں سب کچھ آپ کو ایک جگہ اِس کتاب میں مل جائے گا۔

قیمت :- مکمل سیٹ تین جلد — پندرہ روپے۔ فی جلد پانچ روپے (علاوہ محصولڈاک)

قرآنی قوانین

ایک مختصر لیکن جامع کتاب جو عام طبقہ کے علاوہ جج صاحبان اور وکلاء حضرات کے لئے بڑی مفید ثابت ہوئی ہے۔ اس میں ان تمام احکام کو مرتب کر دیا گیا ہے جو قرآن کریم میں بطور قوانین دیئے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں ان مستقل اقدار کو بھی مدوّن کر دیا گیا ہے جن کی روشنی میں اُمت عصرِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق خود جزئی قوانین مرتب کرے گی۔ (قیمت :- چار روپے۔ (علاوہ محصولڈاک)

تاریخ الامت

قرآنی فکر و بصیرت کے علمبردار بیش رس و دیدہ ور مؤرخ علامہ اسلم جیراجپوری کے قلم سے اُمت کی تمام سرگزشت مختصر، سلیس اور سادہ انداز میں جسے ادارہ نے بڑی محنت سے شائع کیا ہے اور کئی درس گاہوں میں شاملِ نصاب ہے۔ آٹھ جلدوں کے عنوانات حسبِ ذیل ہیں:- (۱) سیرتِ رسولؐ۔ (۲) خلافتِ راشدہ۔ (۳) خلافتِ بنی اُمیہ۔ (۴) خلافتِ عباسیہ۔ (۵) خلافتِ عباسیہ (بغداد) (۶) تاریخِ مصر۔ (۷) آلِ عثمان۔ (۸) پوری تاریخ پر عالمانہ تبصرہ۔ قیمت :- مکمل سیٹ پچیس روپے۔ جلد پنجم۔ چار روپے۔ بقیہ فی جلد تین روپے (علاوہ محصولڈاک)

جہانِ فردا

اس سوال کا جواب کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ مفکرِ قرآن جناب پرویز نے اپنی مدت العمر کے غور و فکر کے بعد اس معرکۃ الآرا تصنیف میں صاف، سادہ لیکن دلکش انداز میں پیش کر دیا ہے۔ یہ کتاب بڑی مفید، بصیرت افروز درحقیقت کشف ہے جس میں موت و حیات، برزخ، حشر، نشر، قیامت، حساب کتاب، اعمال نامہ، میزان، جنت، دوزخ اور حیات و مماث، تمام مباحث آگئے ہیں۔ قیمت آٹھ روپے (ارزاں ایڈیشن) علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ

مکتبہ دین و دانش چوک اُردو بازار لاہور ۶ ادارہ طلوعِ اسلام 25 بی گلبرگ ۲ لاہور

طلوعِ اسلام کنونشن

مجلسِ مذاکرہ

منعقدہ ۲۵ نومبر ۱۹۷۲ء ——— بروز ہفتہ

موضوع: ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

صدارت:۔ محترم شیخ سراج الحق صاحب۔ سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی۔ لاہور

شرکائے مذاکرہ

۱۔ سلمےٰ لطیف۔ (ساتویں جماعت کی طالبہ)
۲۔ تبسم سلطانہ۔ (نویں جماعت کی طالبہ۔ اچھنگ)
۳۔ شہباز مرزا۔ (طالب علم۔ بی۔ آئی۔ سی۔
گورنمنٹ کالج۔ لاہور)
۴۔ ثریا عندلیب۔
۵۔ عبدالقیوم انجم (طالب علم۔ ایم۔ اے۔ انگلش
ایم۔ اے۔ او کالج۔ لاہور
۶۔ محمد نذیر خٹک۔ (ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ۔ مردان)
۷۔ نجمہ فاروقی۔ (طالبہ۔ بی۔ اے)
۸۔ گوگی۔ (پانچویں جماعت)
۹۔ گوگی کی بہن۔ رانی (دوسری جماعت)
۱۰۔ شاہد امین حیدر۔ (طالب علم۔ بی۔ ایس۔ سی)
۱۱۔ مقبول الٰہی۔ (سینئر انگلش ٹیچر۔
اسلامیہ ہائی اسکول مغلپورہ۔ لاہور)
۱۲۔ شہزاد قیصر۔ (ایم۔ اے فلسفہ، گولڈ میڈلسٹ۔)
(مقالہ انگریزی میں تھا اسلئے درج نہیں کیا جا رہا)
۱۳۔ خالد سلام۔ (پروفیسر۔ انجینیرنگ یونیورسٹی۔ لاہور)
۱۴۔ غلام صابر۔ (ایم۔ اے۔
اردو۔ فارسی۔)
۱۵۔ عارفی سلطانہ۔ (ایم۔ اے
فلسفہ، اردو)
۱۶۔ سلمےٰ پرویز۔ (ایم۔ اے)

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

(۱)

سلمیٰ لطیف

صدرِ گرامی و معزز سامعین!

اُنیس سو چونسٹھ میں ہم لاہور آئے ــــ تو یہاں طلوعِ اسلام کنونشن کا چرچا تھا ــــ میں بھی یہی کوئی عرس نما چیز ہوگی ــــ مگر یہاں نہ تو کوئی مزار نظر آیا اور نہ ہی ہو حق کی آوازیں سنائی دیں۔ جو چیز میرے لئے انتہائی باعثِ حیرت تھی۔ وہ یہ کہ یہاں مردوں کے علاوہ عورتوں اور بچوں کی بات بھی توجہ سے سنی جاتی ہے۔ حالانکہ دنیا میں اس وقت جن چند باتوں پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے اُن میں سرِفہرست یہ ہے کہ ــــ عورت کم عقل ہے اور بچے ناسمجھ ــــ لہٰذا اِن دونوں کی آزادی، امنِ عالم کے لئے خطرناک ہے۔ ان دونوں کی بہتری اسی میں ہے کہ ان پر عقل و خرد کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند رکھے جائیں ــــ پوچھئے صاحب! یہ عاقل بالغ نسخہ آپ کو کس نے بتایا؟ ــــ جواب ملے گا حکیم الامت علامہ اقبال نے انہی کے متعلق کہا تھا۔

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

ٹھیک ہے بزرگانِ من ــــ آپ جو کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ لیکن خدارا اپنی بیٹی کو یہ حق تو ضرور دیجئے کہ وہ اپنے دانشور بزرگوں سے اتنا پوچھ سکے کہ ہماری کم عقلی کہیں آپ کی پیدا کردہ ہی تو نہیں؟ ــــ اسلئے کہ پچھلے آٹھ سال سے جو کچھ میں دیکھ رہی ہوں وہ یہ ہے ــــ کہ ہم ناپختہ فکروں کی طرف سے قرآنی درس گاہ کا مطالبہ ہر سال دہرایا جاتا ہے۔ آپ ہر سال یہاں تشریف لاتے ہیں اور ہر سال ہمیں ٹرخا جاتے ہیں۔ اس پر بھی گلہ ہے کہ ہم مسلمان نہیں، چلئے اسے بھی چھوڑیئے ــــ اس لئے کہ ایک قرآنی درس گاہ کا قیام شاید آپ کے لئے بہت بڑی چیز ہے۔ آپ مجھے ایک چھوٹی سی بات بتلایئے۔ اور یہ بات میں خاص طور پر اپنے اُن بھائیوں اور بزرگوں سے پوچھ رہی ہوں جو اپنے آپ کو قرآنی فکر سے وابستہ کر چکے ہیں۔ اور دور دراز کی منزلیں طے کر کے عقل و فکر کی اس محفل میں اپنی پختہ فکری کو پختہ تر کرنے کے لئے یہاں تشریف لائے ہیں۔ آپ مجھے فقط اتنا بتا دیں کہ اگر آپ اپنی بچیوں کو ذہنی تربیت کے یکساں مواقع فراہم کرنے میں واقعی دیانتدار ہیں تو کدھر ہیں آپ کی بیٹیاں؟ ــــ کہاں ہیں میری وہ بہنیں جنہیں قرآن سے محبت ہے مگر انہیں قرآن کی بات بتانے والا کوئی نہیں۔ آپ انہیں خالص قرآنی فکر کی اس محفل میں اسلئے ساتھ نہیں لائے کہ کہیں آپ کی پختہ فکری کا بھرم نہ کھل جائے؟ ورنہ للہ یہ بتایئے کہ اُبھرنے والی نسل۔ اور خاص طور پر لڑکیوں پر عقل و فکر کے تمام دروازے بند کر کے اپنی بلند فکری کا ڈھنڈورا پیٹتے چلے جانا ــــ کہاں کی پختہ فکری ہے؟

بچیوں کو آپ ساتھ نہیں لاتے کہ زمانہ بڑا خراب ہے" بچوں کے لئے درس قرآن کا اہتمام آپ اس لئے نہیں کرتے کہ بچوں کو لانے جانا آپ AFFORD نہیں کر سکتے۔ قرآنی درسگاہ کی تعمیر آپ کے بس کی بات نہیں۔ طلوع اسلام جیسا خالص دینی پرچہ آپ گھر پر اس لئے نہیں منگواتے کہ لوگ آپ کو پرویزی نہ سمجھ بیٹھیں اور شکوہ یہ ہے کہ صاحب! نئی نسل اسلام سے دور بھاگ رہی ہے۔

جناب صدر و بزرگان من! ان تمام کوتاہیوں کے باوجود' اگر آپ کو اصرار ہے کہ آپ کو اپنی اولاد اور اپنے وطن عزیز کے مستقبل سے محبت ہے۔ تو معاف فرمائیے — یہ مرض لاعلاج ہے۔

(۲)

تبسم سلطانہ

صدر محترم' قبلہ باباجی اور میرے واجب الاحترام بزرگو!

آپ کی بیٹی آپ کی خدمت میں اسلام عرض کرتی ہے!

پچھلے دنوں ہمارے ایک عزیز کو ایک سستے مکان کی تلاش تھی۔ کسی نے بتایا کہ ایسا مکان مل تو ضرور جائیگا لیکن ہوگا کسی مسجد کے قریب۔ یہ سن کر وہ خاموش سے ہو گئے۔ میں حیران تھی کہ لوگ مسجد کے قریب رہنا پسند کیوں نہیں کرتے حالانکہ ہمیں خود ہی بتایا کرتے ہیں کہ مسجد خدا کا گھر ہے۔ مسجد میں ہم نماز پڑھتے ہیں' مسجد کے مولوی صاحب اللہ رسولؐ کی باتیں سناتے ہیں اور صبح کے وقت تو بیچارے مولوی صاحب کو کئی کئی گھنٹے بولنا پڑتا ہے یہ ٹھیک ہے کہ مسجد کے قریب صبح کو کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ یہ بھی درست ہے کہ لاؤڈ سپیکر کی آواز بلند اور گونج دار ہونے کی وجہ سے کوئی بات سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ لیکن ہوتی تو آخر نیکی کی باتیں ہیں۔ بات سمجھ میں آئے یا نہ آئے مگر اس کا ثواب تو ہوتا ہے۔

خیر — یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں بہت چھوٹی تھی اور اب تو میری حالت یہ ہے کہ مسجد کے قریب سے گذرتے ہوئے بھی مولوی صاحب سے ڈر لگتا ہے۔ اور ہاں اگر ڈر نہ بھی لگے تو وہاں ہم لڑکیوں کا کیا کام کہ وہاں — نہ جھنڈے نہ جھنگی —!

صاحب صدر! میرے ڈرنے کی ایک وجہ ہے جو آپ کی خدمت میں عرض کرتی ہوں۔ ہوا یوں کہ ہمارے محلے میں ایک دوسری کے آس پاس دو مسجدیں تھیں۔ ایک کے مولوی صاحب بریلی شریف پاس تھے اور دوسری مسجد کے مولوی صاحب کے پاس شاید کسی دوسری جگہ کی ڈگری ہوگی۔ دونوں مسجدوں کے اسپیکروں کا رُخ ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھا۔ اور انہیں اس طرح فٹ کیا گیا تھا کہ مولوی صاحبان کی تقریر اُن کی اپنی مسجد میں تو کم اور دوسری مسجد میں زیادہ سنائی دے۔ بدقسمتی سے ہمارا گھر ان دونوں کے درمیان تھا۔ اور ہمیں اسپیکروں کی گھن گرج تو سنائی دیتی تھی لیکن ہم بات کسی کی بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ اسلئے ہمیں اس سے غرض نہ تھی کہ کون کیا کہتا ہے۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ نماز جمعہ کے بعد ہمارے محلے کے لوگ ایک دوسرے کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔ اور ایک دن تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ لوگ لاٹھیاں

اٹھاتے ایک دوسرے کو مرنے مارنے پر تلے ہوتے ہیں۔ وہ تو بھلا ہو ماسٹر جی کا جنہوں نے کسی نہ کسی طرح اُن لوگوں کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ ورنہ جانے کتنے لوگوں کو جان سے ہاتھ دھونے پڑتے۔

صدرِ محترم! آپ کو معلوم ہے کہ اس جہادِ عظیم کی وجہ کیا تھی؟ وجہ یہ تھی کہ ایک مسجد والوں کا دعویٰ تھا کہ حضور نبی اکرمؐ کا سایہ مبارک تھا اور دوسری مسجد کے امام صاحب نے اپنے نمازیوں کو سمجھا رکھا تھا کہ ایسا کہنے سے حضور نبی اکرمؐ کی عزت پر حرف آتا ہے اور حضورؐ کی عزت کی حفاظت تو بھئی ظاہر ہے ہر مسلمان کا فرض ہے۔ چاہے اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

صدرِ محترم اور میرے بزرگو! میں اب بھی یہ سمجھتی ہوں کہ مسجد آج بھی خدا کا گھر ہے اور مسلمانوں میں بھائی چارے کا واحد ذریعہ ہے۔ لیکن ان مسجدوں کے امام صاحبان کو دیکھتی ہوں اور صحنِ مسجد میں اُن لڑنے والوں کی لاٹھیوں کو تصور میں لاتی ہوں تو دل سے بے اختیار وہی کچھ نکلتا ہے جو آج کے مذاکرے کا عنوان ہے کہ

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

(٥)

(۳)

شہباز مرزا

صدرِ گرامی و سامعین کرام!

آج جب کہ علم و عقل بلندیوں کے دوش پہ تیرتے ہیں۔ زمین و آسمان کی وسعتوں نے انسان کے لئے اپنے دامن وا کر دیئے ہیں اور انسان علم و عقل کی بدولت ہر جگہ دندناتا پھر رہا ہے، اس کی ایجادات شہر شہر اور قریہ قریہ اس کی علمی اور فکری بلندی کی نقیب ہیں۔ اسی آج میں انسانی زندگی کی حالت یہ ہے کہ ہر ساعت میں لاکھوں انسان لقمۂ اجل ہو رہے ہیں۔ گاؤں اور شہر ہر لحظہ اس کی عقل کی گونج سے لرز لرز اٹھتے ہیں۔ باوجود اس کے سائنس دانوں کی جماعتیں سر جوڑ کر اپنے علم و عقل کے سرمائے کے ساتھ اسی سوچ میں محو ہیں کہ کسی طرح بنی نوعِ انسان کی تباہی کی کوئی اور تدبیر ہاتھ لگ جائے۔ آزادیٔ افکار اور خامیٔ فکر کے اس امتزاج نے ساری کائنات کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔

ہمارا ہر عمل جو ارادۃً سرزد ہو رہا ہے خواہ وہ بظاہر کتنا ہی معقول (مبنی بر عقل) کیوں نہ نظر آتا ہو، درحقیقت ہمارے ذاتی مفاد پر مبنی ہوتا ہے۔ انسان انسان کا گلا کاٹنے کے لئے کیسی کیسی عجیب تدبیریں سوچتا ہے۔ انسانی معاشرہ حیوانوں کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سب برائیاں ہمارے ناپختہ شعور ہی کی مرہونِ منت ہیں ــ کمیونزم اور سوشلزم کے فلسفے ناپختگیٔ افکار کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں۔ دہریت کا فلسفہ انہی راستوں کا نشانِ راہ ہے۔ یہ سب حقیقتیں اس بات کی مظہر ہیں کہ تنہا عقل کی راہ نمائی انسان کو صرف تباہی اور بربادی کے جہنم ہی کی طرف کھینچ رہی ہے۔ بعضوں نے تو عقل کو بالکل ہی بے بس قرار دیا ہے۔ ارسطو کے مطابق تو عقل ہماری کسی قوت کو متحرک کر ہی نہیں سکتی۔ ان تحقیقات کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تنہا عقل گو کہ اس کی حدود بہت وسیع ہیں ظن و تخمین کی وادیوں ہی میں بھٹکاتی پھرتی ہے۔ قرآن کریم ہمیں یہ بتاتا ہے کہ عقل کا اپنا دائرہ کار

ہے۔ اس کی فضیلت و افادیت اسی دائرے کے اندر رہتے ہوئے ہے۔ اس دائرے سے باہر اس کے لئے وحی کی قندیلِ آسمانی کی راہ نمائی کی ضرورت ہے۔

سوچنے کی بات اب یہ ہے کہ جب عقل کو وحیٔ خداوندی کی روشنی نصیب ہو چکی تو پھر عقل اس سے برگشتہ کیونکر ہوئی؟ وہ کیا وجوہات تھیں جن کی بنا پر انسان حیوان سے بھی بدتر بن گیا۔ ارتقائے انسانی سے اس بات کی وضاحت ہوتی چلی جاتی ہے۔ انسانوں کے استحصال کے ذمہ دار حیثیت سے ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے گروہ رہے ہیں۔ تنہا عقل ہمیشہ ان کے چنگل میں پھنسی رہی ہے۔ ایسے مواقع پر وحی کی روشنی نے ہمیشہ ان مردہ تنوں میں جان ڈالی ہے۔ اور یوں عقل نے وحی کی زیرِ نگرانی ان کے عزائم کو خاک میں ملا دیا ہے۔ وحی کی روشنی آخری بار ہم تک... ابراہیم خلیل پہنچی اور پھر اُسے قرآن کریم کی دفتین کے اندر محفوظ کر دیا گیا کہ ہم لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔ انسانیت دشمنوں نے آہستہ آہستہ عقل کو وحی کی راہنمائی سے دور کرنا شروع کر دیا۔ اس مقصد کے لئے مذہبی پیشوائیت بڑی شد و مد سے سرگرمِ عمل رہی اور ادھر ہماری عقلوں پر ایسے پتھر پڑے کہ ہم جانتے بوجھتے بھی تباہی و بربادی کی جانب گامزن ہو لئے۔ سامراجیت کے حملوں کا آغاز جوانوں کی صفوں سے ہوا کہ انہیں اپنے مطلب کا RAW MATERIAL (خام مال) یہیں سے مل سکتا تھا۔ یہیں سے ناپختہ اذہان کو تاریک وادیوں میں دھکیل دیا گیا اور یہ اس جال کے تانوں بانوں میں ایسے الجھے کہ اب تک پھڑپھڑا رہے ہیں مگر رہائی کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ آج بھی وحیٔ خداوندی کی روشنی میں جو آگے بڑھتا ہے تاریکیاں اُس کے راستے سے چھٹتی چلی جاتی ہیں۔ روشنیاں اُس کے لئے اپنے دامن وا کر دیتی ہیں۔

آج کے سائنسی بلکہ خلائی دور میں ہم تعلیم کی بدولت ان گھاٹیوں کو عبور کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہم اس میدان کو سیاست و مذہب کی اجارہ داری نہ بننے دیں۔ نصابِ تعلیم کی بنیاد ہے اور آج نصابِ تعلیم میں دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہمیں وحیٔ خداوندی کی روشنی دکھائی نہیں دیتی۔ اسلامی ممالک میں تو حال بہت ہی بُرا ہے۔ یہاں مذہبی پیشوائیت قوانینِ خداوندی کو مسخ شدہ صورت میں پیش کرتی ہے اور پھر یہی کچھ جزوِ نصاب بنتا ہے۔ لہٰذا لوگ مذہب کے نام ہی سے بیگانہ ہیں۔ پاکستان میں نصاب کے نام سے جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ انسان کو انسان تو کجا حیوان بننے میں بھی مدد نہیں دیتا۔ غور و فکر کی صلاحیتوں کو سلب کر لیا جاتا ہے اور بس طوطے کی طرح رٹنا طالب علم کا مقدر بنا دیا جاتا ہے۔ امتحانات کے پردے میں بدعنوانیوں کی کھلم کھلا سرپرستی ہوتی ہے۔ پاکستان کا نظامِ امتحانات، تعلیم کی اُجلی قبا پہ ایک داغ ہے۔ آج کل بھی اس موضوع پہ مذاکرے تو بہت ہوتے ہیں۔ اربابِ اقتدار اگر زبانی کلامی اس نظام کی دھجیاں بکھیر جاتے ہیں مگر عملی طور پر اس نظام کے خاتمے کے لئے کوئی مثبت قدم نہیں اٹھایا جاتا۔ جب نئی تعلیمی پالیسی کا ذکر کیا گیا تو نصاب کے متعلق کچھ کہنا ہی گوارا نہ کیا گیا۔ حالانکہ جب تک بنیادیں ٹیڑھی رہیں گی آپ لاکھ عمارت کو سجاتے بناتے رہئیے۔ عمارت کا مستقبل مخدوش ہی رہیگا۔

آخر میں سب سے اہم مسئلہ کی بابت کچھ عرض کروں گا۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنے شعور کو کیسے سنواریں؟ ہماری فکر میں پختگی کیونکر آئے؟ اگر انسان اپنے یا اپنے ہی جیسے انسانوں کے بنائے ہوئے اصولوں پہ زندگی کی عمارت تعمیر کرتا ہے تو ریت کا ڈھیر بنتا ہے۔ برعکس اس کے اگر وحیٔ خداوندی (یعنی وہ قانون یا ضابطے جن کے مطابق انسانوں کو اپنی زندگی بسر کرنی ہے) کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کرے تو پھر دیکھئے پختگیٔ فکر اور آزادیٔ افکار

کا حسین امتزاج اسے اوجِ ثریا سے بھی بلند تر لے جائے گا۔ اور شعور کی بیداری، فکر و نظر کی تبدیلی صرف اسلامی نظامِ حیات کے تصور کو عام کرنے اور اس کے درخشندہ و تابناک نتائج کو نگہِ بصیرت کے سامنے لانے ہی سے ہوتی ہے پختگیٔ افکار اس وقت تک خیالِ خام ہے جب تک فکر کے ساز کا ہر تار اس سرچشمۂ علم و یقین یعنی قرآن سے ہم آہنگ نہ ہو جائے جس میں شکوک و اضطراب کی کوئی گنجائش نہیں صرف اسی طرح ہم انسان بننے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ بقولِ شاعر ؎

فرشتوں سے بہتر ہے انسان ہونا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

(۴)

ثریا عندلیب

صدرِ عالیمقام و حاضرینِ کرام — تحیت و سلام!

گذشتہ طلوعِ اسلام کنونشن میں ہم نے اپنے معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس تلخ ترین حقیقت کو قبول تھا کہ "ہم آدمیوں کو انسان ہونا میسر نہیں ہوا" اس دفعہ ہمارے مذاکرے کا عنوان حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی زبانی یہ اعلان کر رہا ہے کہ ؎

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

چنانچہ آج کے اجتماع میں ہم نے اپنی بصیرت کے مطابق یہ سمجھنا اور سمجھانا ہے کہ بقول حضرت اقبالؒ فکر کی خامی سے کیا مراد ہے اور آزادیٔ افکار کیا مفہوم رکھتی ہے نیز یہ کہ فکر کی خامی کے تحت آزادیٔ افکار ہوتے ہوئے انسان کیونکر حیوان بن جاتا ہے۔

آیئے ذرا اس پر غور کریں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوگا کہ وہ کونسی کسوٹی ہے جس پر فکر کی خامی کو پرکھا جائے جبکہ معاشرے میں اپنی روزمرہ زندگی میں ہر شخص اپنے اپنے مفاد کے پیشِ نظر اپنی فکر یعنی عقل کو استعمال کرتا ہے اس طرزِ عمل سے کبھی اسے فائدہ ہوتا اور کبھی وہ نقصان اٹھاتا ہے۔ اس لحاظ سے مثال کے طور پر دیکھئے کہ جب ایک چور چوری کرتا ہے تو چوری کرنے کے لئے جو طریقہ وہ اختیار کرتا ہے وہ اس کی فکر کا عکس ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنی سوجھ کے اس طریقے سے چوری کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو کیا چور یہ کہنے میں حق بجانب نہیں کہ اس کی فکر پختہ تھی۔ اگر اس میں خامی ہوتی تو یقیناً وہ چوری کرنے میں ناکام رہتا۔ اسی کے بالمقابل جب مالک مکان اپنے گھر اور مال و عیال کی حفاظت کے لئے اپنی عقل کے تحت مختلف تدبیروں کو بروئے کار لا کر چوروں سے محفوظ رہتا ہے تو لامحالہ اس کی فکر کی خام نہیں کہا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کسی فکر کی خامی یا پختگی کا انحصار اس مقصد کی کامیابی یا ناکامی پر ہوتا ہے جس کے لئے فکر کو کام میں لایا جاتا ہے۔ یعنی فکر بجائے خویش کوئی اہمیت نہیں رکھتی تاوقتیکہ صاحبِ فکر کے سامنے کوئی مقصد متعین نہ ہو۔ تو بات یوں بنی کہ کسی مقصد کے بغیر فکر، فکر نہیں پریشان خیالی

ہے اور اس امر کے لئے کہ فکر پریشان خیالی نہ بننے پائے اور عمل کی صورت دی جا سکے یہ نہایت ضروری ہے کہ پہلے مقصد کا تعین کر لیا جائے۔ فکر کی خامی یا پختگی کے لئے مقصد کا تعین بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اب یہ جاننے کے لئے کہ کون سا مقصد صحیح ہے اور کون سا غلط، کیا کرنا ہوگا؟ اگر اسے صرف انسانوں کے اذہان کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے تو صورت یوں ہوگی کہ چونکہ ہر فرد، ہر گروہ اور ہر قوم کو طبعی طور پر صرف اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے اور انسانی عقل ہمیشہ اپنا ہی مفاد دیکھتی ہے اس لئے ہر مقصد کا دوسرے مقصد سے تصادم اور ہر فکر کا دوسری فکر سے ٹکراؤ ہوگا۔ نتیجۃً معاشرہ فساد فی الارض کی تصویر بن جائے گا۔ جہاں بنی آدم شکل و صورت کے لحاظ سے تو ضرور انسان ہوں گے لیکن کاروبارِ حیات میں ان کے اطوار حیوانیت سے مملو اور ان کے معاملات انسانیت کے لئے ننگ نظر آئیں گے۔

حاضرینِ کرام! آپ جانتے یہ کوئی محض نظری یا خیالی چیز نہیں۔ اپنے معاشرے سے چل کر آپ دنیا کے ہر ملک اور ہر آبادی کو دیکھ جائیے۔ آپ کو ہر جگہ یہ فکری خلفشار اور مقصدی انتشار حقیقی شکل میں نظر آئے گا۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ غلط اور صحیح کا فیصلہ انسانوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا کیونکہ انسانی عقل کے فیصلوں کا معیار صرف اپنا فائدہ اور نقصان ہوتا ہے۔ وہ یہ جان ہی نہیں سکتی کہ

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی!
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

انفرادی عقل ہمیشہ خود بیں ہوتی ہے، جہاں بیں نہیں ہوتی۔ اس کا تقاضا انفرادی مفاد کا تحفظ ہے اور یہی سے معاشرتی ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ انسانوں کی معاشرتی، تمدنی اور اجتماعی زندگی میں جب ایک انسان کا معاملہ دوسرے انسان سے پڑتا ہے تو ان کے باہمی مفاد آپس میں ٹکراتے ہیں۔ اور چونکہ ہر فرد کی فکر یہ چاہتی ہے کہ اس کے مفاد کو کسی قسم کی ٹھیس نہ لگے اس لئے اس میدان میں عقول کی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں فکرِ انسانی کو آزاد چھوڑ دینے سے قدم قدم پر تصادم شروع ہو جاتا ہے اور تمام معاشرہ میں فساد برپا ہو جاتا ہے۔ یہی وہ مقام جہاں وحیِ خداوندی یعنی قرآنِ حکیم نے فکرِ بے لگام یا عقلِ بے باک کو ابلیس کا نام دیا ہے۔ شاعرِ ملت، اقبالؒ قرآنی تہذیب کا ترجمان ہے، لہٰذا اس کی تمام تہذیبی قدریں قرآنی تہذیبی قدریں ہیں۔ وہ عقلِ بے باک کو عقلِ خود بیں کہہ کر پکارتا ہے۔ اور اس عقل کو جو وحی کے تابع کام کرتی ہے، عقلِ جہاں بیں سے تعبیر کرتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ؎

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است
بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است

وہ کہتا ہے:-

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر	سودِ خود بیند نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ	در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

عقل و فکر کا یہ تجزیہ ہمیں بتاتا ہے کہ انسانی عقل از خود سیدھا راستہ اختیار نہیں کر سکتی، اس کے لئے کسی

خارجی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ خارجی روشنی وحی خداوندی کے سوا کچھ اور نہیں۔ فکرِ انسانی صرف فرد متعلقہ کی حفاظت کا انتظام کرنے کی ذمہ داری لیتی ہے جبکہ وحی کا سرچشمہ ذاتِ خداوندی ہے جو افراد سے بلند ہے۔ اس کے نزدیک تمام نوعِ انسانی کے افراد یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ ہر انسان اس سے ایک جیسے فاصلے پر واقع ہوا ہے۔ اس میں نہ رنگ و خون کی تفریق ہے نہ ملک و قوم کی تفریق۔ اس نے انسان کو وہ آزادی عطا کی ہے جو اسے کسی اور جگہ سے نہیں مل سکتی۔ مگر یہ آزادی کیا ہے؟ یہ آزادی قوانینِ حیات سے سرکشی کا نام نہیں بلکہ یہ آزادی خدا تعالےٰ کے عطا کردہ قرآنی اصول و اقدار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے انسانی افکار و اطوار کی آزادی ہے۔ سوچ بچار کی قول و فعل کی آزادی ہے۔ تاکہ انسان اپنے اختیار و ارادے سے اس حقیقی آزادی کے ذریعے خود کو وحی خداوندی کی اطاعت کا پابند بنا سکے کہ یہی پابندی اُسے دوسرے انسانوں کی محکومیت سے آزاد کر سکے گی۔ اسی سچے فلسفہ زندگی کے مدِنظر اقبالؒ اس آزادیٔ افکار کا سخت مخالف ہے جو اپنا محور نہ رکھتی ہو۔ بغیر محور کے آزادیٔ افکار فکرِ خام کا ہی نتیجہ ہو سکتا ہے۔ یہ محور وہ مستقل و غیر متبدل اقدارِ خداوندی ہیں جو بندے کو خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملی ہیں اور نسلِ انسانی کے لئے قرآن پاک میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دی گئی ہیں۔ صرف انہی اقدار کے ساحلوں کے اندر رہتے ہوئے افکارِ انسانی آزادی کا حق رکھتے ہیں اور انہی سے عالمگیر انسانیت کو فروغ ملتا ہے ورنہ مادر پدر آزادی انسان سے انسانیت چھین کر اسی حیوانی سطح پر لا کھڑا کرتی ہے جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے اشارہ کیا ہے۔ اور یہاں سامعین والا قدر! مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ انسان کو حیوان کہہ کر حیوان بیچارے کو بھی خواہ مخواہ بدنام کرنے والی بات ہے کیونکہ یہ حضرت انسان تو جب انسانیت کی سطح سے نیچے گرتے ہیں تو گرتے ہی چلے جاتے ہیں اور پھر ان کا ٹھکانہ تحت الثریٰ ہی بنتا ہے۔ انسان کے حیوانی جذبات کو بے باک چھوڑ دینے کا نتیجہ ہے کہ انسان نوعِ انسان کا شکاری ہے۔ ایک فرد دوسرے فرد کا دشمن اور ایک قوم دوسری قوم کے خون کی پیاسی ہے۔ بَعۡضُکُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ۔ اور اس کا انجام یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَ یَسۡفِکُ الدِّمَآءَ۔ خون ریزیاں اور فساد انگیزیاں۔

حیوانی سطحِ زندگی پر اس کے سوا کوئی اور نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ زندگی جنگل کے قانون کے تابع رہتی ہے۔ اس میں ہر طاقتور اپنے سے کمزور کا خون پیتا ہے۔ اور ہر تیز پنجے والا ضعیف کا گوشت نوچتا ہے بلکہ اس مقام پر میں پھر یہ کہنا چاہوں گی کہ حیوانیت کی یہ مثالیں انسان کی بے راہ روی کے سامنے ٹھہرتی نہیں کیونکہ حیوان جو یہ کچھ کرتے ہیں تو یہ ان کی جبلت کا خاصہ ہے۔ وہ بے راہ روی کر ہی نہیں سکتے۔ وہ تو وہی کچھ کرتے ہیں جو ان کے اندر پہلے سے رکھ دیا گیا ہے۔ انہیں تو قدرت کی طرف سے اختیار و ارادہ دیا ہی نہیں گیا۔ اسی لئے قرآن نے ایسے بے رہرو انسانوں کو حیوانوں سے کہیں زیادہ گیا گزرا قرار دیا ہے۔ اگر انسان کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ اس کی زندگی بس یہی مادی اور طبیعی زندگی ہے تو قرآن کریم اس تصورِ حیات کو کفر سے تعبیر کرتا ہے اور اس کا نتیجہ جہنم بتاتا ہے۔

وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یَتَمَتَّعُوۡنَ وَ یَاۡکُلُوۡنَ کَمَا تَاۡکُلُ الۡاَنۡعَامُ وَ النَّارُ
مَثۡوًی لَّهُمۡ۔ اور جو لوگ کافر ہیں وہ سامانِ زندگی سے فائدہ اٹھاتے ہیں

اور حیوانات کی طرح کھا پی کر مر جاتے ہیں۔ ان کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

جہنم اس لئے کہ اس نظریۂ حیات کے ماتحت ہر قوم اور ہر فرد اپنے طبعی جذبات کی تسکین اور حیوانی مطالبوں کے حصول کو منتہائے حیات سمجھتا ہے۔ یوں اُن کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور یہ دنیا جہنم میں بدل جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب انسانی زندگی کو محض طبیعی زندگی سمجھ لیا جائے تو پھر حیوان نما انسان کے سامنے اس سے بلند مقصدِ حیات کوئی ہو نہیں سکتا۔ یہی ہیں وہ لوگ جن کے متعلق خدا کہتا ہے کہ أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ۔ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنے جذبات ہی کو اپنا معبود و مقصود بنا لیا۔ جذبات کو معبود بنا لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان علم و عقل اور فکر و شعور ہونے کے باوجود ان سے کام لینے کے قابل ہی نہیں رہتا۔ اس کے جذبات اس کی فکری صلاحیتوں کو سلب کر لیتے ہیں۔ وہ اس کی عقل و خرد پر پردے ڈال دیتے ہیں۔ اس کی فکر ہمیشہ خام رہتی ہے۔ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً۔ وہ علم و عقل کے باوجود صحیح راستے پر نہیں آسکتا۔ اس کی سننے سوچنے کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں اور اس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ جب جذبات غالب آجائیں تو عقل و فکر ماؤف ہو جاتی ہے۔ سو جب وہ اس قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو صحیح راستے پر کیسے چل سکتے ہیں۔ فَمَن يَهْدِيهِ مِن بَعْدِ اللَّهِ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ۔ پس قانونِ خداوندی کے علاوہ کون سی چیز صحیح راستے کی طرف ان کی راہ نمائی کر سکتی ہے۔ کیا یہ اتنی سی بات پر بھی غور نہیں کر سکتے؟

اللہ اپنے بندے کو یہ ہدایت دیتا ہے کہ وہ اس کے بتائے ہوئے قانون کے مطابق اپنی عقل کو استعمال میں لائے اور اپنی فکر کو بامقصد بنائے۔ اس لحاظ سے غور و فکر کو جس قدر اہمیت حاصل ہے۔ اس کی تائید قرآن کریم کی سینکڑوں آیات سے ہوتی ہے۔ آپ شروع سے آخر تک قرآن حکیم کو دیکھتے جائیے۔ قدم قدم پر آپ کو غور و فکر کی دعوت ملے گی۔ وہ اپنے ہر دعویٰ کو دلیل و برہان سے پیش کرتا اور اسے تفکر و تدبر کے بعد ماننے کی تاکید کرتا ہے۔ اس نے غور و فکر پر کس قدر زور دیا ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ نبی اکرمؐ کی زبان مبارک سے یہ کہلواتا ہے کہ قُلْ إِنَّمَا أَعِظُكُم بِوَاحِدَةٍ۔ ان سے کہہ دو کہ میں تمہیں صرف ایک بات کی تلقین کرنا چاہتا ہوں۔ غور کیجئے کہ اتنا بڑا جلیل القدر رسولؐ کہتا ہے کہ میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ بات جو کہی جائے گی کس قدر اہم ہوگی۔ اس کے بعد کہتا ہے کہ یہ بات ایسی نہیں کہ تم یونہی چلتے چلتے سن لو۔ أَن تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنَىٰ وَفُرَادَىٰ۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تم جس سیلاب میں بہے چلے جا رہے ہو، اس میں بہے نہ جاؤ۔ کھڑے ہو جاؤ۔ یعنی پہلی بات جس کی تاکید کی جاتی ہے یہ ہے کہ یونہی اندھا دھند نہ چلے جاؤ، بلکہ رُک کر، ٹھہر کر، کھڑے ہو کر، سب کے سب نہیں تو ایک ایک دو دو کر کے سنو۔ اور وہ بات یہ ہے کہ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوا۔ پھر تم سوچو، غور کرو۔ بس یہی ہے وہ بات جس کی میں تاکید کرنا چاہتا ہوں۔ یہی وہ غور و فکر ہے جس کے ذریعے انسانیت بہشت ہے اور معاشرہ جنتی بنتا ہے۔ برعکس

اس کے قرآن کریم فہم و بصیرت سے کام نہ لینے والوں کو بدترین خلائق قرار دیتا اور جہنم کا ایندھن بتاتا ہے۔ غور و فکر وہ عمل ہے جس میں زمین کو بڑی محنت اور مشقت کرنا پڑتی ہے۔ پھر غور و فکر سے زندگی کی نئی نئی راہیں سامنے آتی ہیں جنہیں حرکت و عمل سے ہی طے کیا جا سکتا ہے۔ بے عمل قوم اس سے بھی گھبراتی ہے۔ چنانچہ خام فکری کے جمود میں گرفتار رہ کر افراد قوم انسانیت کی ارفع و اعلیٰ سطح پر نہیں پہنچ پاتے۔ دیکھا جائے تو انسان اور حیوان میں فرق ہی یہ ہے کہ انسان کو غور و فکر کی استعداد دی گئی اور حیوان اس سے محروم ہے۔ یہی وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جس کی بدولت انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا مرتبہ نصیب ہوتا ہے بشرطیکہ صرف یہ ہے کہ اس استعداد کو وحی کے تابع رکھ کر بروئے کار لایا جائے کہ یہی وہ واحد صراطِ مستقیم ہے جس پر چلتے ہوئے فکرِ انسانی خام نہیں رہنے پاتی۔ اور یوں آزادیٔ افکار کی راہ کے جھاڑ جھنکار کٹتے چلے جاتے ہیں۔ جب انسان کو پختگیٔ فکر کے ساتھ ایسی صحیح آزادی نصیب ہوتی ہے کہ اس پر خدا کے قانون کے علاوہ اور کسی کا کوئی دباؤ نہیں ہوتا تو اس کی تمام دبی ہوئی صلاحیتیں اس طرح ابھرتی ہیں کہ وہ اقطار السمٰوٰت والارض یعنی ارض و سما کے کناروں سے بھی آگے چلا جاتا ہے۔ یہاں پھر سے اس صداقت پر ایمان لانے کی ضرورت ہے کہ پختگیٔ افکار ناممکن ہے جب تک انسانی فکر کی ہر افتاد اس سرچشمۂ علم و یقین سے ہم آہنگ و یکرنگ نہ ہو جائے جس میں شکوک و اضطراب کو کوئی دخل نہیں اور جس کا آغازِ سخن لاریب فیہ کے زلزلہ انگیز اور کوہ تمثال دعویٰ حقیقت کشا سے ہوتا ہے

موضوعِ مذاکرہ یعنی خرمودہ اقبالؒ کے اس تفصیلی جائزہ کے بعد آج ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم پر تذبذب اور بے یقینی کی جو اندھیری فضا مسلط ہے اسے علم و یقین کی وحی آمیز روشنی سے دور کریں۔ ہم جانتے ہیں کہ قوموں کا مستقبل ان کی ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اگر قوم کے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو جائے تو قوم خود بخود صحیح قالب میں ڈھل جائے گی۔ ہمیں اس دور میں اپنے نوجوان طبقہ سے ان کے شتر بے مہار ہو جانے کی شکایت ہے ہمیں ان کے بے لگام خیالات سے گلہ ہے، ان کی فکر و نظر سے اختلاف ہے۔ ہمیں ان کی کجروی اور سرکشی کا ملال ہے۔ یہ سب بجا اور درست! مگر ہمیں ایک لمحے کے لئے یہ سوچنا گوارا نہیں کہ اس میں قصور کس کا ہے۔ اس ساری تخریب کا ذمہ دار کون ہے؟ بات تو صاف ہے ہم نے انہیں وہ قرآنی تعلیم و تربیت ہی نہیں دی جو عالمگیر انسانیت کی اساس بنتی ہے۔ ہم نے اپنی ذمہ داری سے کوتاہی برتی، اس کے نتیجے میں ہمیں کچھ انسان حیوان نظر آتے ہیں یا ان سے بھی بدتر، تو رونا کیسا؟ تاہم کتاب کے ہوتے ہوئے مایوس ہو جانے کی کوئی وجہ نہیں۔ اب بھی مہلت کا وقت باقی ہے۔ آج بھی اگر ہم اپنے نوجوان طالب علموں کے دل و دماغ میں اس حقیقت کو راسخ کر دیں کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو وحی کے متعین کردہ مستقل اقدار کے تابع رکھنا ہی شرفِ انسانیت اور پختگیٔ فکر کا ضامن ہو سکتا ہے تو یقیناً ہمیں کل وہ معاشرہ میسر آ سکتا ہے جس کے افراد سیرت و کردار اور افکار و اطوار میں پختگی و پاکیزگی کے جیتے جاگتے پیکر ہوں۔ یہی مقصودِ فطرت ہے۔ یہی منشائے ایزدی ہے۔ اسی کے لئے ہمیں زندگی ملی ہے اور اسی فکر کو اپنا کر ہم حیوانیت سے محفوظ رہتے ہوئے انسانیت کی سطح پر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

سنیئے! اقبالؒ کا زندۂ جاوید پیغام انسانوں کے نام ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اِک انبار تُو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تُو

والسلام!

(۵)

عبدالحقیق انجم

صدرِ گرامی و معزز سامعین!

خدائے لم یزل کا احسانِ عظیم ہے کہ اس ذاتِ بے ہمتا نے مجھ ناچیز کو اس نورانی محفل میں شرکت کا شرف بخشا ہے اور بارگاہِ رسالت میں درود و سلام کا ہدیہ پیش کرتا ہوں جن کی بدولت نوعِ انسانی کو حق و صداقت کی صراطِ مستقیم کا علم ہوا۔ ساتھ ہی مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کی شفقتِ خصوصی کے لئے بھی تشکر و امتنان کے جذبات کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا جنہوں نے مجھے اس قرآنی انجمن میں لب کشائی کی میری دیرینہ آرزو کی تکمیل کا موقعہ فراہم کیا۔ سچ پوچھئے تو یہ میری حوصلہ افزائی ہے جسے میں اپنی خوش بختی تصور کرتا ہوں ؎

نگاہِ ناز جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

حضرات! زیرِ بحث موضوع کا عنوان ہے ؎

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار ✧ انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

فکر کے لغوی معنی ہیں — عام سوچ بچار، دھیان، تدبر، غور وغیرہ۔ اور خام سے مراد کچا، کمزور، باطل۔ خام فکر سے مراد عبوری یا باطل سوچ۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خام فکر وہ فکر ہے جو انسان کو تخریب کا راستہ دکھائے۔ یہ فکر تعمیری اصولوں کے مطابق نہیں ہوتی۔ خام فکر کے مقابل پختہ فکر کا نام لیا جاتا ہے جسے ہم فکرِ رسا بھی کہتے ہیں۔ اس قسم کی فکر اعلیٰ عقل کے معنوں میں بھی استعمل ہے اور یہ ہمیشہ عقل کے تابع رہتی ہے۔ قرآنِ حکیم کی رُو سے فکرِ رسا وہ فکر ہے جو قوانینِ خداوندی کے تابع ہو۔

صاحبِ صدر! اللہ تبارک و تعالےٰ نے بزمِ کون و مکان آراستہ کر کے حضرتِ انسان کو شرافت و بزرگی کی خلعتِ فاخرہ سے نواز کر خلیفۃ فی الارض کے منصبِ جلیلہ پر فائز فرمایا اور اسے عقل و شعور کی گراں بہا دولت بخشی۔

عقل کتابِ ہستی کی مفسّر اور رازِ ہستی کی معلّم ہے۔ یہ شمعِ محفلِ صداقت، اور نورِ حقیقت نما ہے۔ اسی کی بدولت انسان کو جملہ مخلوقات میں افضل و اشرف بنایا گیا ہے اور قدرت نے اسے تفکر و تدبر کی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر تسخیرِ کائنات کی عظیم ذمہ داری سونپی ہے۔

انسان اور حیوان میں بڑا تفاوت یہ ہے کہ انسان عقل و فکر کی خداداد صلاحیتوں سے فطرت کو مسخر کر سکتا ہے جبکہ حیوان عقل و فکر کی صلاحیت سے عاری ہونے کی وجہ سے ہر لحظہ اور ہر لمحہ فطرت کے رحم و کرم پر پڑا زندگی کے دن پورے کرتا ہے۔

صدرِ محفل! سوچ اور تدبر کی نعمت خدا کی دین ہے۔ یہ جوئے رواں اپنی راہ میں حائل ہر قسم کی رکاوٹ کو

اس طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ جیسے طوفانی آندھی اپنے راستہ میں پڑی ہلکی پھلکی چیزوں کو ہزاروں میل دُور لے جا کر اُن کا نام و نشان تک مٹا دیتی ہے۔ فکر و خیال کے بیج کا ماحصل حیران کُن نتائج کے پھولوں کا حامل ہوتا ہے اور عقل و فکر کے استعمال ہی سے آج انسان چاند پر کمندیں ڈال رہا ہے۔ فکر کے نور سے مالا مال قومیں آج بامِ عروج پر پہنچی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف فکر کو بروئے کار نہ لانے والی قومیں قعرِ مذلت میں پڑی سسک رہی ہیں۔

جناب عالی وقار! قرآنِ کریم نے جو ایک مکمل ضابطۂ حیات اور سرچشمۂ رشد و ہدایت ہے۔ انسان کو بار بار عقل و بصیرت کی دعوت دی ہے اور عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو بدتر حیوان قرار دیا ہے۔

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝ (۸/۲۲)

یعنی یقیناً اللہ کے نزدیک سب سے بدتر حیوان (انسان) وہ ہیں جو بہرے گونگے ہو گئے اور جو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔

اسی طرح قرآن میں آیا ہے کہ وہ سُننا جس میں عقل و فکر کا دخل نہ ہو 'بہرہ پن' اور وہ دیکھنا جس میں بصیرت کو دخل نہ ہو 'اندھا پن' ہے۔

سامعین! اب آپ خود ہی اندازہ کیجئے کہ جس قوم کے افراد عقل و بصیرت دونوں سے محروم ہوں۔ اس قوم کی تعمیر کی نہج "منفی" نہ ہوگی تو کیا ہوگی؟

اس مقام پر یہ ذکر کر دینا بھی بے جا نہ ہوگا کہ عقل کی بھی دو قسمیں ہیں۔

اِک دانشِ نورانی، اِک دانشِ برہانی
ہے دانشِ برہانی، حیرت کی فراوانی! (اقبالؒ)

ایک وہ جو مادی خصوصیات رکھتی ہے یعنی "عقلِ معاش"، جس کا منبع شیطان کے وجود میں مضمر ہے۔ یہ عقل مادی دنیا کی تسخیر میں معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے مگر اس کا اندھا دھند استعمال تباہی و بربادی کے تاریک گڑھے میں دھکیل دیتا ہے۔ موجودہ زمانے کے تباہ کن ہتھیار سائنس و عقل کی افراط کا نتیجہ ہیں۔ یہ دو دفعہ دنیا کو ہلاکت کے غار میں پھینک چکے ہیں اور ابھی مزید مہلک ترین ہتھیاروں کی تلاش میں جو دوڑ لگی ہوئی ہے وہ اسی عقل کا نتیجہ ہے۔

حاضرینِ! اس عقل کے برعکس دوسری عقل وہ ہے جس میں محبت کی حکمرانی ہے۔ وہاں عقل محکوم ہے اور عشق حکمران۔ عقل سے حاصل کی ہوئی قوت کو دین کے تابع رکھا جاتا ہے۔ جب یہ مرحلہ طے ہو جاتا ہے تو عقل سے حاصل کردہ قوت ہی بنی نوعِ انسان کے لئے آیۂ رحمت بن جاتی ہے۔ علامہ نے انہیں دو قسموں کو "عقلِ خود بیں" اور "عقلِ جہاں بیں" سے تعبیر کیا ہے۔

صدرِ محفل! دانشِ برہانی کا ثمر فراوانیٔ حیرت کے سوا کچھ نہیں۔ عقل و شعور کی ناپختگی اور بے راہ روی کا خطرناک ترین مقام وہ ہے جہاں عقل ہماری خواہشات کے جواز میں دلائل تراشنا شروع کر دے۔ اس طرح وہ باتیں جو جذبات کی رَو میں بہہ کر کی جاتیں بظاہر عقل کے عین مطابق ہوتی ہیں۔ عقلِ حیلہ جُو کا یہ فریب قابلِ دید ہے کہ میرِ قافلہ ہو کر راہزنی کرنے سے نہیں چوکتی اور اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس فریب میں وہی لوگ

آتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکامات سے منہ موڑ لیتے ہیں اور جن کی عقل نورِ حق سے منور نہیں ہوتی۔ دین کے تابع ہونے والی عقل نورِ حق سے روشن ہوتی ہے اور اس سے وہ اندیشہ و فکر پیدا ہوتا ہے جس کا ذکر قرآنِ حکیم میں بار بار کیا گیا ہے۔ اس عقل کی رہنمائی اسی قلب سے ہوتی ہے جو وحی اور احکامِ الٰہی کی روشنی سے معمور ہوتا ہے۔ مجرد عقل ظن و تخمین میں کھوئی رہتی ہے۔ مگر وحی کی روشنی سے وہ یقین کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔

صدر ذیشان! اگر صرف خرد کی رہنمائی ہو اور عقل کو تابعِ فرمانِ نظر نہ کیا جائے تو وہی عقل سانپ کی طرح ڈستی رہتی ہے۔ ایک سائنس دان اسی عقل کی مدد سے چاند کی تسخیر کر سکتا ہے، سورج کی شعاعوں کو گرفتار کر سکتا ہے۔ لیکن اندرونِ دل کی گہرائیوں تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ اس کی زندگی کی شبِ تاریک میں کبھی سحر نہیں ہوتی۔ اس میں قوت تو ہوتی ہے قلبی اطمینان نہیں۔

کاش کر سکتے کوئی ویرانیٔ دل کا بھی علاج
چاند پر جا کے نئے شہر بسانے والے

سامعین! دورِ حاضر کے انسان نے مادہ کی تسخیر تو کی ہے مگر روحانی نشوونما کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ یہ فطرت پر تو قابو پا سکتا ہے لیکن اخلاقی اقدار سے محروم رہتا ہے۔ اس میں وہ قلبِ سلیم پیدا نہیں ہوا جو اسے انسانیت کے نفع و ضرر سے متعلق فیصلہ کرنے میں مدد ہو۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

حضرات! تاریخ عالم شاہد ہے کہ مادی عقل نے مختلف قوموں کو انتہائی عروج تک پہنچایا ہے لیکن وہ قومیں انسانیت کے اصل مقام سے واقف نہ ہو سکیں۔ پرانے زمانہ میں بابل، مصر، یونان اور روم کی سلطنتیں مادی بلندیوں تک پہنچیں لیکن عقل کے مکر و فن نے ہر جگہ معبودانِ باطل کے تسلط کو ہی قائم رکھنے کی کوشش کی اور ان کی تہذیب اس مقام تک نہ پہنچ سکی جو انسانیت کے لئے وجہِ امتیاز ہے۔ خرد، چراغِ راہگذر کی مانند ہے جو سطحی طور پر رستہ دکھا دیتا ہے مگر درونِ خانہ کے بھید اس کے علم سے باہر رہتے ہیں۔

خرد سے راہرو روشن بصر ہے — خرد کیا ہے؟ چراغِ رہگذر ہے

سامعین کرام! عقل کی ہدایت کے لئے جب تک خاص اصول مقرر نہ ہوں، وہ راستہ کے کسی مقام کو ہی منزل قرار دے سکتی ہے۔ یہ اصول ہیں احکامِ خداوندی جو عقل و فکر کے لئے سرچشمۂ ہدایت ہیں اور عقل و فکر انہیں اصولوں کے تابع رہ کر پختہ ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر یہی فکر قوانینِ خداوندی کے مطابق کام نہ کرے تو یہ انسان کو انسانیت کی سطح سے گرا کر حیوانیت کی سطح پر لے آتی ہے جس قوم کے افراد کی عقل و فکر ناپختہ ہو اس قوم کی فکری آزادی اس کے لئے سوہانِ روح بن جاتی ہے۔ اس قوم کی آزادی، بے راہ روی میں تبدیل ہو کر رہ جاتی ہے اور اس قوم کے افراد بے سلیقہ ہو جاتے ہیں۔

صدر انجمن! انسان کی فلاح و بہبود کا راز صرف مادی ترقی میں نہیں بلکہ روحانی اور اخلاقی بہتری بھی مطلوب ہے۔ تہذیبِ مغرب نے اگرچہ بہت ترقی کی ہے لیکن وہ "بے حرم" ہے۔

قرنِ اولیٰ کے مسلمانوں نے اپنی فکر کو ہمیشہ احکامِ قرآنی کے تابع رکھا۔ پھر دنیا کی آنکھ نے انہیں انسانیت کی بلند و بالا معراج تک پہنچتے دیکھا۔ انہوں نے مادی ترقی کے ساتھ ساتھ روحانی ترقی بھی حاصل کی۔ انہوں نے قوانینِ خداوندی پر عمل کر کے نصف دنیا پر حکمرانی کی۔

اس کے برعکس آج کے مسلمان تباہی سے ہمکنار ہیں۔ یہ صرف اسی وجہ سے ہوا کہ انہوں نے احکامِ الٰہی کو یکسر فراموش کر دیا۔ ان کی سوچ غیر قرآنی بن کر رہ گئی ہے۔ ہم اپنے آپ کو قرنِ اولیٰ کے مسلمانوں کی اولاد تو کہتے ہیں مگر ہم میں وہ عمل ناپید ہے جو ان کا عمل تھا۔ ہم نے اپنے آباؤ اجداد سے جو میراث پائی اسے مکمل طور پر فراموش کر بیٹھے ہیں۔ ہم نے سیاسی آزادی تو حاصل کر لی مگر ذہنی اور فکری طور پر ابھی تک پاتال کی جانب لڑھک رہے ہیں۔

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسمان نے ہم کو دے مارا

ہماری فکر منفی نہج پر جاری و ساری ہے۔ یہ تخریب کی جانب رواں دواں ہے۔ ہمارے اخلاق کا مکمل طور پر دیوالہ نکل چکا ہے۔ "ہاکس بے" کا واقعہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔ اسی منفی فکر کا نتیجہ ہے کہ ہم آج تک اپنی منزل تک رسائی حاصل کرنا تو درکنار اپنی منزل کا تعین تک نہ کر سکے۔

منزل تو خیر کب تھی ہمارے نصیب میں
ہاں یہ ہوا کہ گھر سے بہت دور آ گئے

صدرِ محترم! علامہ اقبالؒ نے پوری زندگی ہمیں عقل و فکر کی دعوت دی مگر ہمارے ہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہم ان تعلیمات پر عمل نہیں کرتے۔ اس کے نتیجہ میں جب ہماری تباہی کا وقت قریب آتا ہے تو ہم اپنی "تقدیر" پر شاکی نظر آتے ہیں کہ ہماری تقدیر اور قسمت میں یہی لکھا تھا۔ یہ کتنی بڑی خود فریبی ہے جسے مذہبی پیشوائیت نے ہمارے اذہان میں رچا بسا دیا ہے۔

جنابِ صدر! انسان اپنی تقدیر خود بناتا ہے۔ ایسا صرف اس وقت ہو گا جب اس کی فکر پختہ اور وحی کے تابع ہو گی۔

سامعین! ہمارے پاس خدائے قدوس کی طرف سے ودیعت کردہ سرچشمۂ ہدایت یعنی قرآن مجید تو موجود ہے مگر ہم ان اصولوں پر عمل کرنے سے گھبراتے ہیں۔ ہم اس کے کئی صفحات روزانہ باقاعدگی سے تلاوت تو کر لیتے ہیں مگر ان پر غور و فکر کئے بغیر آگے گذر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا کوئی تعمیری نتیجہ ہمارے سامنے نہیں آتا۔ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ آج مسلمان اپنی اصل منزل سے کتنا بھٹک چکا ہے۔ یہی انسان جسے قدرت نے تمام مخلوقات میں اشرف پیدا کیا وہ آج خود ہی اپنی عظمت کی دھجیاں اڑا کر حیوانی سطح کی زندگی سے بھی بدتر زندگی گذارنے پر مجبور ہے۔

وہی انسان جسے سرتاجِ مخلوقات ہونا تھا
وہی اب ہی رہا ہے اپنی عظمت کا کفن ساقی

جنابِ صدر! اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم قرآنی سرچشمۂ ہدایت سے اپنی عقل اور فکر کو پختہ کریں۔ اس طریق

کو اپنانے سے ہم اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو سنوار سکیں گے اور ساتھ ہی اپنی اس منزل کو پا لینے میں کامیاب ہو سکیں گے جو قرآن نے ہمارے لئے مقرر کیا ہے۔ بصورتِ دیگر اگر ہم نے اپنی عقل و فکر کو خام ہی رہنے دیا تو یاد رکھئے اس حقیقت کو کوئی نہ جھٹلا سکے گا کہ

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!

پھر جب ہم قانونِ مکافات کی زد میں آئے تو
ہماری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

(۰)

(۶)

محمد نذیر خٹک

صدرِ گرامی، معزز خواتین و حضرات!

ماہِ رمضان میں مجھے ایک دوست کے ساتھ افطاری کا اتفاق ہوا۔ افطاری کے بعد میری طبیعت قدرے بوجھل ہو گئی۔ تراویح پڑھنے نہ جا سکا۔ البتہ میرے دوست جو مغربی تہذیب کے بڑے دلدادہ ہیں، ماہِ رمضان میں اپنے خاندانی روایات کے مطابق اپنے محلے کی مسجد میں ختم القرآن کا اہتمام ضرور کرتے ہیں۔ وہ مسجد چلے گئے۔ میں بستر پر لیٹ گیا۔ اُن کا ملازم چائے لے آیا۔ میری طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اُن کے آنے تک وقت کیسے گزارا جائے اتفاقاً میری نظر ایک الماری پر پڑی۔ میں اٹھا۔ الماری کھولی تو بے شمار انگریزی رسالے پڑے تھے۔ میں نے ایک رسالہ اٹھایا۔ دیکھا تو صفحۂ اول پر مار یوانہ سے بھری ہوئی سگریٹ کی ایک دلکش تصویر بنی ہوئی تھی اور اُس کی دھوئیں کی دھار بل کھا کر ہوا میں تحلیل ہوتی تھی۔ سگریٹ کے اردگرد نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک ہجوم تھا جن میں سے بیشتر دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے سرور میں مدہوش تھے۔ ساتھ ہی بڑے حروف میں تحریر تھا۔ (A PEACEFUL MOMENT) یعنی پُرسکون۔

ورق الٹایا۔ نظر فہرستِ مضامین پر پڑی۔ عجیب عجیب موضوعات تھے۔ موقع کی مناسبت کے مطابق دو ایک موضوعات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک موضوع تھا۔ GO NAKED ON MOVEMENT یعنی تحریک عریانیت کو فروغ دو۔ اس مضمون میں بس کھیتی جو تحریک کی سرگرم رکن ہے، رسالے کے نامہ نگار کو انٹرویو دیتی ہوئی اپنے فکرِ خام کا اظہار یوں کرتی ہے۔

"عریانی انسان کا پیدائشی حق ہے۔ نہ جانے بعض لوگ اس سے ناراض کیوں ہوتے ہیں۔ میں تو زیادہ دیر تک کپڑوں کا بوجھ اپنے جسم پر گوارا نہیں کر سکتی۔ کیونکہ مادر زاد ننگا رہنے سے میری جنسی جذبات کو تسکین ہوتی ہے۔"

ایک دوسرے مضمون کا عنوان تھا "HOMO-SEXUAL'S APPEAL" یعنی ہم جنس پسندوں کی اپیل۔ مضمون کی تفصیل یہ ہے کہ امریکہ کے ایک ریاست میں ہم جنس پسندوں نے ایک انجمن قائم کی ہے جو اراکین کے حقوق

کی تحفظ کریگی۔ انجمن نے مضافات میں ایک وسیع پلاٹ خرید کر رہائشی مکانات تعمیر کئے ہیں اور پھر اپنے ہم مشربوں سے اپیل کی ہے کہ وہ ان مکانات میں آباد ہو جائیں تاکہ اکثریت بن کر مقامی سینٹ میں اپنا نمائندہ کامیاب کریں۔ انجمن نے آخر میں برٹش پارلیمنٹ کے اس اقدام کو بے حد سراہا تھا اور مبارک باد دی تھی کہ انہوں نے ہم جنس پسندوں کو قانونی تحفظ دے کے دوسرے ممالک کے لئے مثال قائم کی ہے۔ رسالہ بند کر کے میں بیساختہ گنگنانے لگا۔ مرحبا ابن آدم مرحبا۔ آزادیٔ فکر ہو تو ایسی ہو۔ اتنے میں آدم خان واپس آ گئے اور آتے ہی کہنے لگے "یار! آج مجھے معلوم ہوا کہ صحیح نماز کس طرح پڑھی جاتی ہے"۔ میں نے اصرار کیا "بھئی! ہمیں بھی طریقہ بتلایئے۔ تاکہ ہم بھی استفادہ کر سکیں۔ آپ کا ثواب ہو جائے گا"۔ بولنے لگے "دراصل بنیادی چیز نیت ہوتی ہے اور نیت باندھنے کا طریقہ مولوی صاحب نے یہ بتا دیا ہے کہ اللہ اکبر پڑھتے وقت اپنے سر کو اوپر کی طرف خفیف سی حرکت دینی چاہیئے۔ (انہوں نے عملی نمود بھی پیش کیا)۔ یہ دو طرفہ تماشہ دیکھ کر پہلے تو میں متردد ہوا۔ ایک طرف مغرب کی فکری آزادی اور دوسری طرف مشرق کے فکری جمود۔ سوچ بچار کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مشرق کی فکری جمود ہو یا مغرب کی فکری آزادی، عروج آدم کے راستے میں دونوں حائل ہیں۔ کیونکہ فکر تو ہر دو مقامات پر خام ہی کارفرما ہے۔ اور فکر خام کو مقید ہی رکھنے میں انسانیت کی فلاح ہے کیونکہ

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!

جناب! یہی شعر اس مذاکرے کا موضوع ہے۔ آیئے ہم اس شعر کا تجزیہ کریں۔ مگر معذرت چاہتا ہوں، تجزیہ کرنے سے پہلے مجھے اپنے ایک رفیق کو مطمئن کرنا ہوگا۔ انہیں شکایت ہے کہ شاعر انسان کے حیوان بننے پر اس قدر سیخ پا کیوں ہوتے ہیں۔ دونوں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ انسان حیوان ہی کی بڑھی ہوئی شکل ہے۔ حیوان سے یوں بیزاری کے اظہار کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم گذشتہ نسلوں سے شرمسار ہیں۔ میں ان کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہوں کہ حیات ایک مربوط پروگرام کے مطابق مختلف منازل سے گذر کر پیکر بشریت میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔ اب اس پر لازم ہے کہ اگلی منزل میں داخل ہونے کے لئے تیاری کرے، نہ کہ منزل حیوانیت کی طرف واپس لوٹنے کے لئے۔ ورنہ گنگا الٹی ہو جائے گی۔ اور آپ جانتے ہیں کہ جس دیش میں الٹی گنگا بہتی ہو وہاں پر حیوانی جذبات کی حکمرانی ہوتی ہے اور مجبور قیدیوں کو بھی گولی ماری جاتی ہے۔

ہاں تو میں اس شعر کا تجزیہ کرنا چاہتا تھا۔ اس ضمن میں ہمیں دیکھنا یہ ہوگا کہ فکر کیا ہوتی ہے۔ فکر خام سے کیا مراد ہے۔ فکر خام کو آزادی دینے سے انسانی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کیا فکر خام کی اصلاح کی بھی کوئی صورت ہے؟

تو سنیئے۔ فکر قدرت کا وہ عطیہ ہے جو آدم کو دوسرے حیوانات سے ممتاز کر دیتا ہے۔ فکر ہی وہ شرف ہے جس سے انسان مسجود ملائکہ قرار پایا۔ فکر ہی وہ بنیاد ہے جس پر قصر تمدن کی بلند و بالا دیواریں کھڑی ہوتی ہیں۔ یہ فکر ہی کا کرشمہ ہے کہ ذرائع آمد و رفت کی جہان کن برق رفتاری سے زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں۔ ہمالیہ کا پہاڑ انسان نے اپنے پاؤں تلے روند دیا ہے۔ ایٹم کی غیر مرئی قوت سے فضا کا سینہ چیر کر حضرت انسان سماوی کروں کے دہلیز پر کھڑا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

کیوں؟ اس لئے کہ

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار ٭ انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

قدرت کی فیاضی دیکھئے کہ وہ ہر انسانی بچے کو تمام مطلوبہ صلاحیتیں پیدائش ہی سے غیر نشوونما یافتہ صورت میں عطا کر دیتا ہے۔ اِن غیر نشوونما یافتہ اور منتشر مخفی صلاحیتوں کے مجموعے کا دوسرا نام فکرِ خام ہے۔ اب یہ ذمہ داری معاشرے کے انتظامی ڈھانچے پر عاید ہوتی ہے کہ وہ فکرِ خام کے عناصر میں حسین امتزاج اور ہم آہنگی پیدا کر کے بچے کو مثالی انسان بنائے یا عدم توازن سے حیوانی پہلو کو فروغ دے کر معاشرہ میں فساد پھیلانے کے لئے ابلیسی قوت میں اضافہ کرے۔

اگر فکرِ خام کی متوازن نشوونما کے لئے معاشرہ اجتماعی طور پر منظم و مربوط مساعی نہ کرے۔ تو اس کی تباہ کاریاں انفرادی حدود تک ہی محدود نہیں رہتیں بلکہ قومی سرحدات پھاند کر پوری عالم انسانیت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مصر ہو یا یونان، چین ہو یا ترکستان، روم ہو یا ایران۔ اِن قدیم تہاذیب کے کھنڈرات آج بھی انسان کے فکرِ خام کی تاسف انگیز اور جگر پاش داستانیں بزبانِ حال سنا رہی ہیں۔ دور نہ جائیے۔ عصرِ حاضر کی تہذیب پر نگاہ ڈالئے۔ آج کے انسان نے جو کائنات گیر مادی قوت حاصل کی ہے، تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے مگر مقصودِ حیات صرف مادی ترقی نہیں۔ کیونکہ

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

یہی وجہ ہے کہ نصف صدی کے قلیل عرصہ میں اِن بے پناہ قوتوں کے حامل انسان کی بے چینی کا اظہار جی۔ اے۔ ڈاریی نے اپنی کتاب سیولائیزیشن میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

"ہماری موجودہ تہذیب اپنے قومی، معاشی، عائلی، اخلاقی، مذہبی اور ذہنی نظام کے ہر شعبہ میں حماقت، جہالت، فریب اور ظلم کا مستقل مظاہرہ ہے"

فکرِ خام کی ہلاکت انگیزیوں کے تازہ مثال دیکھنا چاہتے ہو تو پاکستان کی گذشتہ صرف پانچ سال کی تلخ تاریخ دیکھئے۔ بس ایک طوفان اٹھا جس نے آگ کی چنگاریوں کو فضا میں بکھیر دیا۔ ایک سیلاب آیا جو قومی متاع کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔ ایک بجلی گری جس نے آشیانوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔ ایک نعرہ اٹھا جس سے ساری قوم گلی کوچوں، سڑکوں، بازاروں، سکولوں، کالجوں، کھیتوں اور کارخانوں میں دیوانوں کی طرح رقص کرنے لگی۔ ایک بگل بجا جس سے میدانِ کارزار گرم ہوا۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ ہزاروں جانیں تلف ہو گئیں۔ عصمتیں لٹ گئیں۔ سینکڑوں کنبے یتیم ہو گئے۔ انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیا گیا۔ بس ایک ہُو کا عالم تھا۔ قیامت کا منظر تھا۔ ملک دو دھڑا ہو چکا تھا۔ ملت کی کشتی نامعلوم دھارے میں ہچکولے کھا رہی تھی۔ مگر بقول شاعر

کشتیاں سب کی کنارے پہ لگا کرتی ہیں　　　ناخدا جن کا نہ ہو ان کا خدا ہوتا ہے

صرف وہی قوم فکرِ خام کی تباہیوں سے بچ سکتی ہے جو اپنی کشتی خدا کے سہارے چھوڑ دے۔ یہی جواب ہے میرے اُس آخری سوال کا کہ کیا فکرِ خام کی اصلاح کی بھی کوئی صورت ہے؟ جواب اثبات میں عرض کر چکا ہوں کہ اصلاح کی صورت ضرور ہے بشرطیکہ انسان محض عقل کو سرچشمۂ علم نہ سمجھے کیونکہ عقل اسباب و ذرائع پر تو خوب نگاہ رکھتی ہے مگر مقاصد و اقدار کی طرف سے اندھی ہوتی ہے۔ ہمیں عقل کے علاوہ اُس سرچشمۂ علم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے جو یہ اعلان کرتا ہے کہ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی یعنی جس خدا نے کائنات کی ہر شے کو پیدا کیا ہے۔ اس نے یہ انتظام بھی کر رکھا ہے کہ ان اشیا کو بتائے کہ ان کی منزلِ مقصود کونسی ہے اور وہ اس منزل تک کس طرح پہنچ سکتی ہے۔ اس رہنمائی کو وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے جو خدا کی طرف سے براہِ راست ملتی ہے۔ خارجی کائنات میں اس رہنمائی کو قوانینِ فطرت کہا جاتا ہے اور حیوانات کی دنیا میں اسے جبلت کہتے ہیں۔ ہر شے ان قوانین کی زنجیروں میں جکڑی ہوتی ہے اور ان کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔

وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَهُمْ لَا یَسْتَكْبِرُوْنَ ۝

لیکن انسان کی کیفیت اس سے مختلف ہے۔ اگر وہ بھی دیگر اشیاءِ کائنات کی طرح اس طرح پابند کیا جاتا تو وہ صاحبِ اختیار و ارادہ نہ رہتا۔ اسکا اختیار و ارادہ وہ شرفِ عظیم ہے جس کی بدولت اسے دیگر اشیائے کائنات پر فضیلت حاصل ہے کیونکہ جس میں انتقام کی قوت نہیں اگر وہ اپنے مجرم کو معاف کر دے تو یہ بزدلی ہے عظمت نہیں۔ انسان کی طرف رہنمائی بھیجنے کے لئے طریقہ اختیار کیا گیا کہ ایک فرد کی طرف وحی کی جاتی۔ وہ اسے دوسرے انسانوں تک پہنچاتا۔ اور یہ ان کی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا کہ وہ اسے قبول کریں یا اس سے انکار کریں۔ چنانچہ ہبوطِ آدم کے ساتھ ہی اُس کی طرف وحی بھیجنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ جب بھی اور جہاں بھی کوئی انسانی حدود فراموش ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اصلاح کے لئے ایک برگزیدہ فرد بھیجا۔ رُشد و ہدایت کا یہ سلسلہ اُس وقت تک وقتاً فوقتاً جاری رہا جب تک آخری مکمل ابدالآباد تک رہنمائی دینے والے پیغام بھیجنے کے لئے فضا سازگار نہ تھی۔ آخر الامر وہ دور بھی آیا جبکہ انسان کو جامع صورت میں وہ تمام اصول و ضوابط اور قوانین و احکام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین کے ذریعے تفویض کئے۔ یہی وہ ضابطۂ حیات ہے جو انسان کے لئے مقصدِ حیات متعین کرتا ہے اور پھر اس کے حصول کے لئے اسباب و ذرائع اور طور طریقے نہایت وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ یہی وہ مینار ہے جس سے راہ گم کردہ بھولی بھٹکی انسانیت منزل کے سمت کا تعین کر سکتی ہے۔ یہی وہ آفتاب ہے جس سے فکرِ خام کو روشنی مل سکتی ہے۔ یہی وہ تریاق ہے جس سے فکرِ خام کے زہریلے جراثیم کے اثرات کو زائل کیا جا سکتا ہے۔

حضرات! باعثِ صد افتخار ہے یہ مقام کہ آج جبکہ ہر طرف افراتفری ہے، بے چینی ہے اور انسان منزل سے بے خبر حیرت و استعجاب کی وادی میں سرگرداں و پریشان کھڑا ہے۔ آپکا یہ قافلہ فکرِ قرآنی کی مشعل اٹھائے ہوئے پوری دلجمعی کیساتھ منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ منزل لحظہ بلحظہ قریب ہوتی جا رہی ہے۔ اگر آپکے ارادوں میں پختگی اور ہمت میں یہ استقلال ہو تو بعید نہیں کہ وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا۔ کی عملی تفسیر آپ اپنے آنکھوں ہی سے دیکھ لیں۔

آخر میں میں اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ التجا کرتا ہوں کہ اے مغرب کے ناخداؤ! مارکس کے شیدائیو! مادے کے پرستارو! اسلام کے نام لیواؤ اور بالخصوص پاکستان کے غمخوارو! آؤ۔ دوڑ کر آؤ۔ یہ شمع اٹھاؤ اور انسانیت کا مستقبل سنوارو۔ ورنہ

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

حقائق وعبر

۱۔ کم از کم ایک ایک لونڈی

آجکل مجلس دستور ساز میں یہ شور ہر روز سننے میں آتا ہے کہ مجوزہ دستور غیر اسلامی ہے کیونکہ اس میں احکامِ شریعت کی ضمانت نہیں دی گئی۔ اس کی ایک مثال جمعیت العلماء اسلام کے رکن اسمبلی مولانا نعمت اللہ صاحب نے، اپنی تقریر میں پیش کی جو پاکستان ٹائمز کی یکم مارچ ۱۹۷۳ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں انہوں نے فرمایا۔

غلامی کو منسوخ کرنا خلافِ اسلام ہے۔ جو شخص ایک سے زیادہ بیویوں کی استطاعت نہ رکھتا ہو، ایسا انتظام کیا جائے کہ کم از کم وہ ایک لونڈی رکھ سکے۔

معلوم نہیں کہ ایوان میں کسی نے مولانا صاحب سے یہ دریافت کیا یا نہیں کہ ان کے ذہن میں وہ کون سی تجویز ہے جس کی رو سے حکومت اس طرح لونڈیاں مہیا کرنے کا انتظام کر سکے گی۔ مودودی صاحب کی تجویز تو یہ ہے کہ جنگ میں گرفتار شدہ عورتوں کو لونڈیاں بنایا جائے گا۔ لیکن ایک تو یہ لونڈیاں سپاہیوں میں تقسیم کی جائیں گی اور دوسرے ان کی تعداد اس قدر نہیں ہوگی کہ انہیں ملک کی عام آبادی کو بھی مہیا کیا جا سکے۔ کیا کوئی صاحب مولانا نعمت اللہ صاحب سے دریافت فرمائیں گے کہ اگر اقتدار ان کے ہاتھ میں دے دیا جائے تو وہ لونڈیاں سپلائی کرنے کا کیا انتظام فرمائیں گے ؟

ہمارے ہاں یہ قانون موجود ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کی بے عزتی کرے تو وہ شخص اس کے خلاف ہتکِ عزت کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ کیا ملک میں کوئی ایسا قانون نہیں جس کی رو سے ان لوگوں کے خلاف بھی چارہ جوئی کی جا سکے جو اسلام کو اس طرح ذلیل و رسوا کریں ؟

۲۔ معتبر ترین شہادت

قومی اسمبلی میں پیپلز پارٹی کے ڈپٹی لیڈر اور مرکزی وزیر شیخ محمد رشید صاحب نے ایوانِ اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے کہا۔

میں مسلم لیگ کا رکن رہ چکا ہوں اور تحریکِ پاکستان کے سلسلہ میں جیل بھی جا چکا ہوں۔ اس تحریک کے حقیقی محرک کے بارے میں مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ تحریکِ پاکستان کی واقعاتی شہادتوں کے گہرے مشاہدے سے ظاہر ہوگا کہ قیامِ پاکستان کی بنیاد مذہب نہیں تھا۔ غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کو عبادت کرنے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔ البتہ مسلمانوں کا استحصال روزمرہ کا معمول تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے مسلمانوں کا استحصال ختم کرانے کے لئے انتھک کوشش کی مگر وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ جب

> تک مسلمان ہندو کے ساتھ رہیں گے وہ اقتصادی استحصال سے نجات نہیں پا سکیں گے۔ پاکستان کیلئے مسلمانوں کی جدوجہد طبقاتی جدوجہد تھی۔ (جسارت۔ ۱۶ مارچ)

ہم شیخ صاحب کی خدمت میں کچھ عرض کرنے والے تھے۔ لیکن جب ہم نے ان کی تقریر کا اگلا فقرہ پڑھا تو ہم نے اپنے قلم کو کھینچ لیا لیا۔ انہوں نے کہا کہ

> سوشلزم پر میرا عقیدہ میرے ایمان کا جزو ہے۔ (ایضاً)

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کا سوشلزم پر عقیدہ جزوِ ایمان ہوتا ہے ان کے نزدیک محمد رسول اللہ نے جو جنگ قریش کے خلاف لڑی تھی، اس کا جذبہ محرکہ بھی (معاذ اللہ) اقتصادی تھا۔ یہ حضرات اگر تحریکِ پاکستان کے متعلق یہ کچھ کہیں تو کونسی تعجب کی بات ہے!

~~~~~~(۰)~~~~~~

۳۔ اور مفتی صاحب نے فرمایا

شیخ رشید صاحب کی تقریر پر تنقید کرتے ہوئے مفتی محمود صاحب نے کہا۔

> یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ مگر حکمران پارٹی کے ڈپٹی لیڈر شیخ رشید نے کل اپنی تقریر میں اسمبلی کو بتایا ہے کہ قیامِ پاکستان کا محرک مسلمانوں کا معاشی استحصال تھا۔ شیخ رشید کی اس تقریر کے بعد ہمارے ان خدشات میں اضافہ ہو گیا ہے کہ حکومت ملک میں کیا کرنا چاہتی ہے۔ (جسارت۔ ۱۶ مارچ)

کیا ہم مفتی صاحب سے دریافت کر سکتے ہیں کہ اگر تحریکِ پاکستان کا مقصد اسلام کے لئے مملکت حاصل کرنا تھا تو آپ اور آپ کے معتقد حضرات نے اس تحریک کی اس قدر مخالفت کیوں کی تھی؟ یا کیا آپ کو بھی مودودی صاحب کی طرح یہ بات یہاں آکر معلوم ہوئی ہے کہ یہ ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔ مودودی صاحب تحریکِ پاکستان کے دوران پورے حتم و یقین کے ساتھ اعلان کیا کرتے تھے کہ

> مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں کی کسی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمعِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔ (ترجمان القرآن جلد ۱۵۔ عدد ۱۔ صفحہ ۲۴)

اور اب وہ اٹھتے بیٹھتے فرماتے ہیں۔

> اس ملک کے مستقبل اور اس کی آفرینش کا انحصار ایک ہی چیز پر ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جو وعدہ تحریکِ پاکستان کے دوران میں کیا گیا تھا اسے ایمانداری کے ساتھ پورا کیا جائے۔ وعدہ یہ تھا کہ اس سرزمین کو اسلام کا گہوارہ بنایا جائے گا۔ اس میں اسلام کا قانون نافذ کیا جائیگا۔ (ایشیا۔ ۴ فروری ۱۹۷۲ء)

~~~~~~(۰)~~~~~~

۴۔ نیپ اور ۵ قومیتیں

بلوچستان کے سابقہ وزیر اعلیٰ اور نیپ کے ایک ممتاز رہنما سردار عطاء اللہ مینگل کا ایک انٹرویو کراچی کے روزنامہ

جسارت کی ۵ مارچ کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس میں حسب ذیل سوال اور جواب قابل توجہ ہیں۔

(س) ملک کے موجودہ حالات میں نیپ کے تصورِ قومیت سے قومی وحدت کو نقصان پہنچ رہا ہے تو آپ اس پر سختی سے جمے رہنے پر کیوں مصر ہیں۔؟

(ج) قیامِ پاکستان سے قبل وطنِ عزیز پانچ علیحدہ قومیتوں کا مسکن تھا۔ ان قومیتوں کی زبان، تہذیب و تمدن، معاشرت، روایات اور جغرافیائی حدود بھی علیحدہ علیحدہ تھیں۔ تحریکِ آزادی کی کامیابی کے بعد جب بنگال، سندھ، بلوچستان، سرحد اور پنجاب کے علاقوں پر مشتمل پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو یہ توقع پیدا ہو گئی تھی کہ یہ پانچ قومیتیں جن کا دین مشترک ہے پاکستانی قومیت میں بتدریج ضم ہو جائیں گی۔ پاکستانی قوم کے اس تصور کو شروع شروع میں سب ہی نے تسلیم کر لیا۔ لیکن لیاقت علی خان کے بعد ملک میں جمہوریت قومیتوں اور ان کے تہذیبی ورثے کے ساتھ ایسی سازشیں اور سیاسی اٹکھیلیاں کی گئیں کہ ایک پاکستانی قومیت کا سحر ٹوٹنے لگا۔

اس کے بعد انہوں نے کہا۔

دراصل پانچ قومیتوں کا تصور سندھ، بلوچستان، سرحد، پنجاب، اور بنگال کے عوام کی محرومیوں کی بنا پر شدت سے ابھرا جو بنگال میں ایک تاریخی اور افسوسناک سانحہ کے بعد عملی شکل اختیار کر گیا۔

(س) نیپ کے پرچم میں ۵ تارے پانچ قومیتوں کے اتحاد کی علامت ہیں۔ ایک قومیت علیحدہ ہو گئی۔ اس کے باوجود ۵ تارے کس بات کی نمازی کرتے ہیں۔ کیا آپ متوقع ہیں کہ یہ قومیت پھر آملے گی اور اسی انتظار میں پرچم پر اس کی جگہ باقی ہے؟

(ج) نیپ کا مطالبہ یہ ہے کہ بنگلہ دیش منظور کیا جائے۔ جس روز حکومت اسے تسلیم کر لے گی پرچم پر چار تارے رہ جائیں گے۔

یہ ہے پانچ یا چار قومیتوں کا عملی مفہوم ان حضرات کے نزدیک!

۵۔ خبر لیجو دین بگڑا!

پچھلے دنوں سے ایک بزرگوار جنہیں قدرت اللہ فاطمی کے نام نامی سے متعارف کرایا جاتا ہے اکثر ٹی۔ وی پر تشریف لاتے ہیں جن ان کا جماعتِ اسلامی کے خلاف پراپیگنڈہ ہے۔ اس جماعت کے مسلک سے طلوعِ اسلام کو جس قدر اختلاف ہے۔ وہ واضح ہے۔ ہم آج سے نہیں ۱۹۴۷ء سے اس کی مخالفت کرتے چلے آرہے ہیں کیونکہ ہمارے نزدیک یہ جماعت پاکستان اور اسلام دونوں کو سخت نقصان پہنچا رہی ہے۔ لیکن فاطمی صاحب جس انداز سے اس جماعت کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس سے کچھ اور ہو یا نہ ہو اسلام کا تیا پانچا ضرور ہو جاتا ہے۔ ان کے ارشاداتِ عالیہ کا لبِ لباب یہ ہوتا ہے کہ دین کو سیاست میں دخل انداز نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ ایسا کرنا قرآن کے بھی خلاف ہے اور سنتِ رسول اللہ کے بھی خلاف۔ دوسرے یہ کہ حاکمیت عوام کو حاصل ہے۔ خدا کو نہیں۔

ہم فاطمی صاحب سے تو کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ وہ یا تو دین کی حقیقت سے قطعاً بے خبر ہیں یا ان کی کوئی مجبوریاں ان سے یہ کچھ کہلوا رہی ہیں۔ لیکن ہم کارپردازانِ ٹی۔ وی سے اتنا ضرور کہیں گے کہ آپ اسلام کو تو چھوڑیئے کہ اس سے آپ سے کسی خیر

کی توقع نہیں ہوسکتی۔ آپ کم ازکم اتنا ہی سوچئے کہ جس مقصد کے لئے آپ یہ کوشش کر رہے ہیں، اس انداز کے پروگراموں سے وہ مقصد بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ ان سے الٹا آپ کے خلاف لوگوں کے دل میں حقارت کے جذبات ابھرتے ہیں۔ اس لئے آپ اگر اسلام کی خاطر نہیں تو کم ازکم خود اپنے مفاد کے پیشِ نظر اس قسم کے پروگراموں کا جائزہ لے لیا کریں۔

تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!

۶۔ کتاب اللہ کے نادان دوست

ہمیں ذاتی طور پر تو علم نہیں لیکن اخبارات میں خبر شائع ہوئی ہے کہ :-

> پنجاب اسمبلی میں ایک قرارداد پیش کی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اخبارات و رسائل میں قرآنی آیات چھپنے سے قرآن کی توہین ہوتی ہے کیونکہ یہ اخبارات و رسائل ردی میں بیچ دیئے جاتے ہیں۔ اس لئے قرآنی آیات چھاپنے کی ممانعت کر دی جائے اور صرف ترجمہ شائع کیا جائے اور متن شائع کرنے والوں کو سزا دی جائے۔

(المنبر۔ ۲۳ مئی ۷۲ء)

اگر یہ خبر صحیح ہے (خدا کرے کہ یہ صحیح نہ ہو) تو ہم نہ صرف اراکین اسمبلی (پنجاب) سے، بلکہ خود حکومتِ پنجاب سے، مرکزی حکومتِ پاکستان سے مسلمانانِ پاکستان سے بلکہ مسلمانانِ عالم سے درخواست کریں گے کہ وہ خدا کے لئے اس قرارداد کو پاس ہونے سے روکیں۔ قرآن مجید اپنے الفاظ میں خدا کا کلام ہے اور دنیا کی کسی زبان میں اس کا ترجمہ حتٰے کہ خود عربی زبان میں اس کے مترادفات اس کے متن کا بدل نہیں ہوسکتے۔ اگر اس کا ترجمہ بلا متن شائع کیا جائے تو اس کا حشر وہی ہوجائے گا جو (مثلاً) انجیل کا ہوا۔ آج دنیا میں اس انجیل کا ایک فقرہ بھی کہیں نہیں ملتا جو حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی۔ اور تراجم کا یہ عالم ہے کہ ایک ترجمہ دوسرے ترجمہ سے نہیں ملتا۔ حتٰے کہ ایک ہی ترجمہ کے مختلف ایڈیشنوں میں کتنا ہی فرق ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا قرآن مجید کی اس "توہین" کو روکنے کا اور کوئی طریق نہیں؟ اس "توہین" کو روکنے کے لئے قرآنی متن کی طباعت ہی کو روک دینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی سر درد کا علاج سر کو کاٹ دینا تجویز کرے۔ پھر اسے بھی تو سوچئے کہ آج آپ ان اخبارات اور رسائل کا ذکر کرتے ہیں جن پر قرآنی آیات چھپی ہوتی ہیں۔ اگر آپ نے کبھی خود قرآن مجید کے اوراق کو بھی ردی میں دیکھ لیا تو ڈر ہے کہ آپ اس "توہین" کو روکنے کے لئے قرآن مجید کی طباعت ہی خلافِ قانون نہ قرار دے دیں۔

نادان دوست بھی دنیا میں کس مصیبت کا موجب بن جاتے ہیں۔

ضرورت ہے

ماہنامہ طلوعِ اسلام بابت مئی ۱۹۳۸ء تا اکتوبر ۱۹۳۸ء کی جلد فائل یا الگ الگ پرچے، اگر کوئی صاحب دینا چاہیں تو وہ ادارہ ہذا کو مطلع فرمائیں۔ ادارہ کو ان کی ضرورت ہے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ لاہور

رابطۂ باہمی

بزمہائے طلوعِ اسلام اپنی اپنی جگہ تحریک کے فروغ اور اس آواز کو ملک کے گوشے گوشے تک پھیلانے کے لئے سعی و کاوش کر رہی ہیں۔ حال ہی میں موضع **ڈھاب پڑی** (تحصیل چکوال ضلع جہلم) کے متعدد احباب نے بھی جو سالہا سال سے طلوعِ اسلام لٹریچر کے مطالعہ سے فکری طور پر اس کے ساتھ ہم آہنگ ہو چکے ہیں، چکوال کے گرد و نواح میں منظم طور پر فکرِ قرآنی کی نشر و اشاعت کے لئے بزم کی تشکیل کی تجویز کی ہے اور محترم بشیر ملک صاحب کو اپنا نمائندہ منتخب کیا ہے۔ ادارہ اس بزم کے قیام کی توثیق کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بشیر ملک صاحب اور اراکینِ بزم ڈھاب پڑی کے خلوص اور بلند ارادوں میں استقامت عطا فرمائے۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں

ہر اتوار۔ صبح ۹ بجے

بمقام

۲۵۔بی گلبرگ (۲)۔ لاہور

ٹیلیفون:۔ ۸۰۸۰۰

ملتان میں

ہر جمعہ۔ بعد از نمازِ جمعہ

(بذریعہ ٹیپ)

بمقام۔ دفتر شاہ سنز۔ بیرون پاک گیٹ ملتان

ٹیلیفون:۔ ۲۰۷۱

سیالکوٹ میں

ہر اتوار۔ صبح ۱۰ بجے

(بذریعہ ٹیپ)

بمقام۔ نی سٹال۔ کرسچن ٹاؤن۔

بالمقابل پتھر سیالکوٹ (۲)

کراچی میں

ہر اتوار۔ صبح ۹½ بجے۔

(بذریعہ ٹیپ)

بمقام:۔ دفتر بزم طلوعِ اسلام۔ 11/13 فردوس مارکیٹ

(بالمقابل بس سٹاپ)۔ پہلی چورنگی۔ ناظم آباد۔ کراچی ۱۸

ٹیلیفون:۔ ٦١٠٦٨

SOLE MANUFACTURERS

of

FOUR SPINDLE
AUTOMATIC
PIRN WINDING
MACHINES

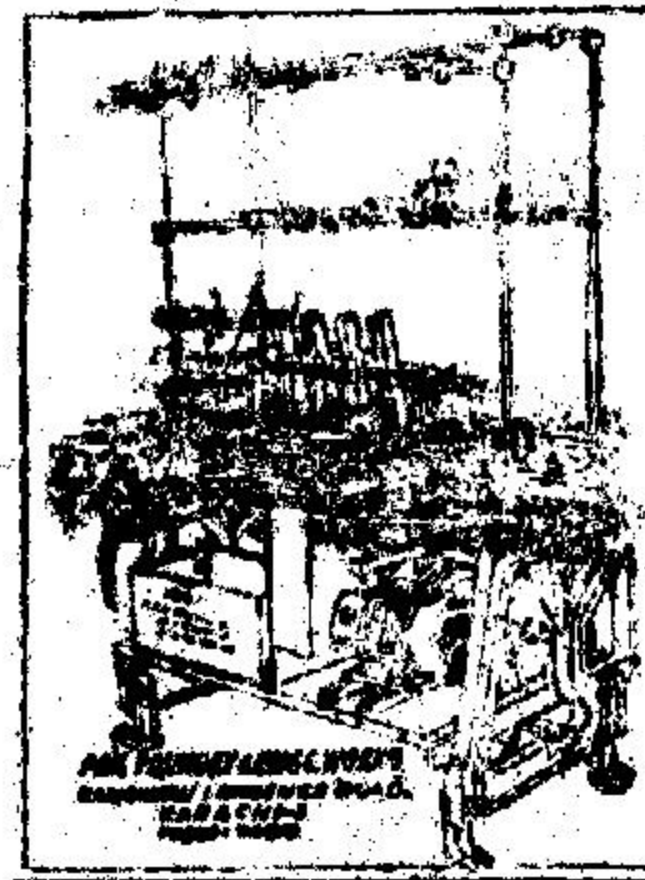

PAK FOUNDRY & ENG.G WORKS

RAMSWAMI

LAWRENCE ROAD

KARACHI 3 PHONE: 74614

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۞ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

O ye who believe! Fear God as He should be feared, and die not except in a state of Islam. And hold fast, all together, by the Rope which God stretches out for you, and be not divided among yourselves.

PREMIER TOBACCO INDUSTRIES LIMITED